Sociology & Cultural Research Review (SCRR)
Available Online: https://scrrjournal.com
Print ISSN: 3007-3103 Online ISSN: 3007-3111
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

# Studying Socio-Cultural Factors and Linguistical Changes Behind the Growth and Progress of Urdu Linguistics: From Its Genesis unto the Era of Ghalib

# اُردو لسانیات کی نمووارتقا کے پس پردہ تہذیبی ولسانی تغیرات؛ آغاز سے عہد غالب تک

**Dr. Yasir Zeeshan Mughal**
Assistant Professor Urdu, Governmnet Jinnah Islamia Graduate collge, Sialkot
yzazeemi@gmail.com
**Tahira Rubab**
Ph.D Urdu Scholar, Governmnet Collge Universty, Lahore.
tahirarubabazeemi@gmail.com
**Abrar Khattak**
Associate Professor Urdu, Governmnet Post Graduate collge, Noswshera, KPK.
abutalha.abrar@gmail.com

## ABSTRACT

*The evolution of language is a long process, which goes through various stages influenced by social, cultural, civilizational, historical and linguistic changes. The Urdu language also went through these stages and attained the status of a scientific method of understanding "linguistics". Urdu linguistics also reached the stages of evolution, saturated with cultural and social colors. By drinking the juice of different civilizations, times, languages and dialects, it began to establish its own identity, due to which its linguistic and literary colors improved over time. Our literary creators nurtured this process and enriched the language. From Amir Khusro to Nawadar-ul-Alfaaz, Darya-e-Latafat, Khatam-e-Naskh, there is a long list of great classical poets and prose writers that reaches Ghalib, whose role in this evolution of the Urdu language is very important. They gave a new direction to the language in their poetry and prose and added spiritual and linguistic experiments to it, which further strengthened the structure of Urdu and increased its creative abilities. Ghalib and other literary creators like him created innovation and uniqueness in the use of words in their poetry and prose, and made new linguistic experiments to further improve the structure of the Urdu language. And by giving a new shape to this evolution with their linguistic consciousness, they gave the Urdu language an important place not only in the literary world but also in society and human psychology. In addition, the role of the Scientific Society of Fort William College, Aligarh Movement has also been very important in them. Urdu linguistics has made unprecedented progress through various genres of poetry, experiments in language and rhetoric, various linguistic and literary traditions such as allegory, etc. The creators of poetry and prose, through all the intellectual and artistic manifestations of linguistics (phonetics, vocabulary, meanings), rhetoric and orthography, not only enriched this language in terms of literature and language, but also gave it breadth and charm, through which Urdu has achieved the most important place in the world culture. This entire journey was indebted to civilization and society, and all poets and prose writers, through cultural and social expression, not only established themselves by aligning Urdu linguistics with various dimensions, but also established Urdu among the developed languages of the world. In this article, an attempt has been made to critically examine the social, civilizational journey and tradition of Urdu linguistics from its beginnings to the Ghalib era, so that it can be known that no language can be separated from its civilization, culture, civilization and society, and the linguistic evolution of the Urdu language is not only associated with literary and linguistic capital, but it is also connected to the cultural background.*

***Keywords**: Evolution, Language. Social, Cultural, Civilizational, Historical, Linguistic Changes.*

## ملخص

زبان کا ارتقا ایک طویل عمل ہوتا ہے، جو معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی، تاریخی اور لسانی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اردو زبان نے بھی ان مراحل سے گزرتے ہوئے سائنسی طرز تفہیم "لسانیات" کا درجہ پایا۔ اردو لسانیات نے بھی تہذیبی اور سماجی رنگوں سے سیر اب ہو کر ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ مختلف تہذیبوں، زمانوں، زبانوں اور بولیوں کا رس پی کر اس نے اپنی الگ شناخت قائم کرنے لگی جس سے اس کے لسانی اور ادبی رنگوں میں وقت کے ساتھ نکھار آتا گیا۔ اس عمل کی ہمارے ادبی تخلیق کاروں نے آبیاری کی اور زبان کو ثروت مند بنایا۔ امیر خسرو سے لے کر نوادرالالفاظ، دریائے لطافت، خاتم وناسخ، عظیم کلاسیکی شعرا ونثر نگاروں کی طویل فہرست ہے جو غالب تک پہنچتی ہے، جن کا اردو زبان کے اس ارتقا میں کردار نہایت اہم ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور نثر میں زبان کو نیا رخ دیا اور اس میں معنوی اور لسانی تجربات کا اضافہ کیا، جس سے اردو کی ساخت مزید مضبوط ہوئی اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا۔ غالب اور ان جیسے دیگر ادبی تخلیق کاروں نے اپنی شاعری اور نثر میں الفاظ کے استعمال میں جدت و انفرادیت پیدا کی، اور اردو زبان کی ساخت کو مزید بہتر بنانے کے لیے نئے لسانی تجربات کیے۔ اور اپنے لسانی شعور سے اس ارتقا کو نئی شکل دے کر اردو زبان کو نہ صرف ادبی دنیا میں بل کہ سماج اور انسانی نفسیات میں بھی اہم مقام عطا کیا۔ علاوہ ازیں ان میں فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک کی سائنٹفک سوسائٹی کا کردار بھی بہت اہم رہا ہے۔ شاعری کی مختلف اصناف، زبان و بیان کے تجربات، مختلف لسانی وادبی روایتوں جیسے ایہام گوئی وغیرہ کے ذریعے سے اردو لسانیات نے بے مثال ترقی کی۔ شعر ونثر کے تخلیق کاروں نے لسانیات کے سارے فکری وفنی مظاہر (صوتیات، لفظیات، معنیات) بیان وبدیع، املائی ارتقا کے ذریعے نہ صرف اس زبان کو ادبی ولسانی لحاظ سے ثروت مند بنایا بل کہ وسعت اور دل پزیری بھی عطا کی، جس کے ذریعے اردو نے السنۂ عالم میں اہم ترین مقام حاصل کیا۔ یہ سارا سفر تہذیب اور سماج کے مرہون منت رہا، اور تمام شعرا اور نثر نگاروں نے تہذیبی اور سماجی اظہار کے ذریعے اردو لسانیات کو مختلف الجہت وسعتوں سے ہمکنار کر کے نہ صرف خود کو امر کیا بل کہ اردو کو بھی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں جگہ دی۔ اس مقالے میں آغاز سے عہد غالب تک، اُردو لسانیات کے سماجی، تہذیبی سفر اور روایت کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ جانا جاسکے کہ کسی بھی زبان کو اس کی تہذیب، ثقافت، تمدن اور سماج سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور اردو زبان کا لسانی ارتقا نہ صرف ادبی اور لسانی سرمائے سے وابستہ ہے بل کہ یہ تہذیبی پس منظر سے بھی جڑا ہوا ہے۔

انسان اپنی ذات میں ایک وسیع کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ انسان کی شخصیت، خیالات اور جذبات اتنے وسیع اور پیچیدہ ہیں کہ ایک پوری کائنات کو اپنے اندر سمو سکتے ہیں۔ اس لیے اس کے اندر ایک زبردست تخلیقی صلاحیت، ذہنی وجذباتی گہرائی اور دنیوی افکار کا ایک وسیع اور متحرک جہان آباد ہے۔ جہاں اس کے اندر اترے والے بے شمار خیالات، تصورات، اور احساسات مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور ایک دنیائے فکر کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ اور جب وہ منظرِ عام پر آنا چاہتے ہوں، یعنی یہ خیالات اور احساسات انسان کی ذہنی اور جذباتی دنیا میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں تو انہیں اظہار کی خواہش ہوتی ہے۔ یوں یہ جہان ہمہ وقت بے چین رہتا ہے تاکہ وہ اپنے خیالات کو الفاظ میں ڈھال سکے اور انہیں دنیا کے سامنے لا سکے۔ غالب نے کہا تھا:

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو[۱]

یہ محشر خیال حرف وصوت کا متلاشی اور الفاظ کا جویا ہے۔ گویا انسان اپنے ہونے کا باضابطہ اظہار زبان کے ذریعے کرتا ہے۔ زبان جو منطقی الفاظ کا مجموعہ ہے، اس کی شخصیت کا عکس ہے۔ زبان کے بغیر انسان نامکمل ہے کیوں کہ زبان ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے جذبات، خیالات اور افکار کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اپنی داخلی دنیا کو بیرونی حقیقت میں تبدیل کرتا ہے۔ زبان نہ صرف انسان کے ذہنی اور جذباتی اظہار کا ذریعہ ہے بل کہ اس کی تہذیب، ثقافت اور شناخت کا مظہر بھی ہے۔ ہر قوم کی زبان اس کے تمدن، تاریخ اور فلسفہ کی عکاسی کرتی ہے، اور یہی زبان انسان کے رشتہ کو اپنے معاشرتی ماحول سے مضبوط کرتی ہے۔ اس کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کے بغیر انسان کا تصور ناقص اور غیر مکمل ہے۔ زبان انسان کی روح کی زبان ہے، اور یہی وہ دروازہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی داخلی اور خارجی دنیا کے بیچ پل کا کام کرتا ہے۔

زبان ایک عضو بدن بھی ہے اور قرینۂ اظہار بھی، ہر دو صورتوں میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ زبان، جسے فارسی میں زبان عربی میں لسان اردو میں جیب، انگریزی میں Tongue کہتے ہیں، ایک بیش بہا نعمتِ خداوندی ہے جس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، وہ کم ہے، بقول آتش:

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے[۲]

آہنگی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ہر لفظ میں ایک ایسا معنی چھپتا ہے جسے پڑھنے والا یا سننے والا نہ صرف سمجھتا ہے بل کہ اس پر تبادلۂ خیال کے ذریعے اپنی رائے بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح زبان نہ صرف ربط کا وسیلہ بن کر معاشرتی تعلقات کو مستحکم کرتی ہے بل کہ فرد کی ذاتی نشو نما اور اجتماعی ہم آہنگی کی بھی ضامن بنتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"دنیا میں زبان کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسانی سماج، زبان کو اپنے وجود اور عمل کے لیے کم از کم دو انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بولنے والا (متکلم) اور دوسرا سننے والا (سامع) چنانچہ جب سے یہ دونوں انسان وجود میں آئے، زبان بھی پیدا ہو گئی اور جب تک یہ دونوں موجود رہیں گے، زبان بھی نہیں مر سکتی یعنی زبان کا وجود انسانی سماج کا محتاج ہے۔"[۵]

انسانی معاشرت میں زبان کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح ہے، کیونکہ زبان ہی وہ وسیلہ ہے جو انسان کو اپنے خیالات، جذبات اور تجربات کا اظہار کرنے کا امکان فراہم کرتا ہے۔ زبان کے بغیر، انسان اپنے وجود کی مکمل صورت میں نہ صرف اپنے آپ کو سمجھ پاتا ہے، بل کہ دوسروں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور اجتماعی زندگی میں حصہ لینے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک لازمی عنصر کی طرح ہے، جو انسان کی ذاتی اور اجتماعی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

زبان ارتقائے حیات کے لیے اسی طرح لازم ہے جس طرح ہوا، پانی اور خوراک، جیسے عناصر زبان انسان کے ذہنی و فکری ارتقا اور سماجی شعور کی پختگی اور بالیدگی کی ضامن ہے۔ جیسے یہ عناصر زندگی کے لیے ضروری ہیں، ویسے ہی زبان انسان کے ذہنی و فکری ارتقا کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ زبان کی بدولت انسان اپنے فکری و ذہنی عمل کو شکل دیتا ہے، اپنے نظریات اور عقائد کی تشکیل کرتا ہے، اور اپنے جذبات کو نہ صرف خود سمجھتا ہے بل کہ دوسروں تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو فرد کی سوچ کی پختگی اور سماجی شعور کی بالیدگی کا ضامن بن کر اس کی ذاتی اور اجتماعی ترقی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اردو ادب میں بھی زبان کی یہ اہمیت بار بار سامنے آتی ہے، جہاں زبان کو ایک تخلیقی طاقت، فکری گہرائی اور انسانی وجود کے جوہر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ شعر و ادب میں زبان صرف اظہار کا وسیلہ نہیں ہوتی، بل کہ یہ انسان کی ذات کی گہرائیوں میں چھپے خیالات، احساست اور معانی کو آشکار کرنے کا ایک عظیم ذریعہ ہوتی ہے۔ یہی زبان انسان کے سماجی شعور کی عکاسی کرتی ہے، جہاں فرد اپنی ذات کو معاشرتی حقیقتوں اور دوسرے افراد کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ لہٰذا، زبان کا معاشرتی اور ذاتی ارتقائی عمل میں وہی کردار ہے جو روح کا جسم میں ہے، جس کے بغیر انسان کا فکری و ذہنی ارتقا ممکن نہیں ہو سکتا اور نہ ہی معاشرت میں اس کی حیثیت قائم رہ سکتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم فارانی زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"زبان وہ بامعنی آوازیں یا علامتیں ہیں جن کی وساطت سے انسان بصورت تقریر یا بصورت تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں سے بذریعہ سماع یا مطالعہ معلومات اخذ کرتا ہے، اسی لیے زبان کو تبادلہ، خیالات اور اظہار خودی کا آلہ کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تمام حروف اور تمام الفاظ یا الفاظ کے مجموعے (مرکبات) جو تحریر یا تقریر میں استعمال ہوتے ہیں، زبان کے دائرے میں داخل ہیں اور اردو زبان کے عناصر سمجھے جاتے ہیں۔"[۶]

زبان انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ تمام مذہبی، معاشرتی، تاریخی، فنی، سائنسی اور تکنیکی علوم کا ذخیرہ زبان ہی کے توسط سے ہم تک پہنچتا ہے۔ زبان ہی سے قربت اور محبت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ حصولِ مقاصد اور منزلوں تک رسائی زبان کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال اپنی تصنیف "لسانیات، زبان اور رسم الخط" میں لکھتے ہیں:

"سماج اور معاشرہ کی بنیادی اکائیوں میں سے ایک اکائی زبان بھی ہے۔ معاشرتی اشتراک میں زبان ایک مشترک عنصر ہے جو کہ سماجی فعالیت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ معاشرے میں انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والے باہمی تعلقات میں زبان کا کردار بڑا جاندار ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کی تشکیل زبان کی تشکیل

زبان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں سے ایک بے مثل و بے نظیر عطا ہے، جو انسان کے لیے ایک بے پایاں فیض و فضل کی مانند ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت گویائی، یعنی بولنے کی صلاحیت سے نوازا ہے، جو نہ صرف اس کے وجود کی تکمیل کا حصہ ہے بل کہ اس کی فطری ضرورت بھی ہے۔ اس قوتِ گویائی کو انسان کی تخلیق کے آغاز سے ہی اللہ کی طرف سے خاص مقام و مرتبہ عطا کیا گیا، کیونکہ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی داخلی دنیا کو خارجی دنیا میں منتقل کرتا ہے، اپنے افکار و جذبات کو اظہار دیتا ہے اور اپنی شناخت کو اجاگر کرتا ہے۔

جب غار حرا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو اس وحی کے ابتدائی الفاظ ہی انسان کی زبان کی اہمیت اور اس کے ذریعے علم و معرفت کے ابلاغ کی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی یہ پہلی وحی جو اس قدر عظیم پیغام کے ساتھ آئی، اُس میں جو الفاظ تھے وہ خود ایک عظیم تر پیغام تھے۔ جس کے الفاظ میں نہ صرف علم کی اہمیت بیان کی گئی بل کہ زبان کے ذریعے علم کے حصول اور اس کے پھیلاؤ کا آغاز بھی ہوا۔ وحی کے ان لفاظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے زبان کو علم و حکمت کے دروازے کے طور پر متعارف کرایا، جس سے انسان کی فہم و فراست کی نئی راہیں کھل گئیں۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ: "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔"[۳]

یہ آیتِ مبارکہ صرف ایک حکم نہیں، بل کہ انسان کے لیے ایک روشن راہنمائی ہے کہ زبان کو استعمال کرتے ہوئے انسان اپنے رب کی حکمت و علم کا شعور حاصل کرے اور اس علم کے ذریعے اپنی روحانی و دنیاوی زندگی کو بہتر بنائے۔ زبان کا استعمال نہ صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے بل کہ یہ اللہ کی ہدایات کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا بھی ایک وسیلہ ہے۔ غالباً اسی زبان کی بدولت ہی انسان نے حیوان ناطق ہونے سے اشرف المخلوقات کا شرف حاصل کیا۔ زبان ہی کی بدولت وہ اپنے احساسات و جذبات، تصورات و خیالات اور ماضی الضمیر کے ابلاغ پر قادر ہے۔ تقریر کے مقابلے میں تحریر یعنی لکھ کر خیالات کی ترسیل کا رواج بہت بعد میں ہوا۔

زبان جس سے مراد "بولی" یا مخصوص طرزِ اظہار ہے، اس کے بارے میں مختلف ماہرینِ لسانیات نے مختلف آراء پیش کی ہیں جو اپنی جگہ مسلمہ اور معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ سید محی الدین قادری زور اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں زبان کی تعریف بیان کرتے ہیں:

"زبان خیالات کا ذریعہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے... زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے، اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"[۴]

زبان چوں کہ معاشرے میں رابطے کا ذریعہ ہے، اس لیے اس کا تعلق انسانوں کے باہمی روابط اور تفہیم سے گہرا ہے۔ زبان ایک ایسا ذریعۂ اظہار ہے جو انسانوں کے درمیان خیالات، جذبات، اور مفاہمت کی ترسیل کو ممکن بناتی ہے۔ اس کے ذریعے ہر فرد اپنے اندر کی دنیا کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور دوسروں کے خیالات، احساسات، اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بل کہ انسانوں کے درمیان رشتہ قائم کرنے، افہام و تفہیم کی بنیاد رکھنے، اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک ہمہ گیر وسیلہ ہے۔ جب ہم زبان کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ محض ایک یک طرفہ عمل نہیں ہوتا، بل کہ اس کا مقصد دوسروں کو نہ صرف اپنے الفاظ کا مفہوم سمجھانا ہوتا ہے بل کہ ان سے جوابی ردعمل یا مکالمہ کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ زبان کی یہ دوجانبہ خصوصیت اسے ایک جاندار اور متحرک عمل بناتی ہے، جس کے ذریعے افراد ایک دوسرے سے جڑتے ہیں، اپنے تجربات اور خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی فکری و جذباتی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو زبان کا یہ باہمی تعلق، "مکالمہ" اور "تفاہم" کی صورت میں منظرِ عام پر آتا ہے، جہاں ہر لفظ اور ہر جملہ نہ صرف اپنے اندر ایک معنی چھپائے ہوتا ہے بل کہ وہ اپنے مخاطب سے ایک ردعمل کی امید بھی کرتا ہے۔ یہ لسانی تعامل معاشرتی زندگی کا حصہ بن کر فرد کی شناخت کو وسعت دیتا ہے اور اس کے اندر ذہنی و جذباتی ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں بھی زبان کی یہی اہمیت دکھائی دیتی ہے، جہاں شاعری اور نثر میں لفظوں کا انتخاب محض اظہارِ خیال نہیں ہوتا بل کہ یہ ایک گہری تفہیم اور آپس کی ہم

اور ردو بدل پر اثرانداز ہوتی ہے۔ زبان کی تراش خراش بناوٹ گراوٹ میں معاشرتی عمل کی کارفرمائی سے انکار کسی بھی طور پر ممکن نہیں۔"[۷]

زبان زندگی کے ہر پہلو میں نہ صرف موجود ہے بل کہ اس کی بنیاد ہے۔ انسان کی تخیلاتی دنیا سے لے کر اس کے مشاہدات و حقائق کی وسیع و عریض حقیقتوں تک، زبان ہر مقام پر ایک بنیادی اکائی کا درجہ رکھتی ہے۔ زبان صرف خیالات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بل کہ یہ انسان کی فکری و تخلیقی صلاحیتوں کی گہرائیوں کو سموئے ہوئے ہے، جو انسان کو اپنی داخلی دنیا سے باہر کی حقیقتوں تک رسائی فراہم کرتی ہے۔

جہاں جہاں انسان اپنے تخیل، علم، اور فکر کی روشنی سے روشناس ہوتا ہے، وہاں وہاں زبان کی عملداری کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ انسان کی تمام تخلیقات، خواہ وہ علمی ہوں یا ادبی، فلسفیانہ ہوں یا سائنسی، زبان کے ذریعے ہی دنیا تک پہنچتی ہیں۔ زبان انسان کی فطری خواہشات کا عکس ہے اور اس کی ذہنی توانائی کی مظہر، جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر میدان میں اپنا اثر مرتب کرتی ہے۔

ادبی اور کلاسیکی تناظر میں زبان کی یہ اہمیت مزید اجاگر ہوتی ہے، کیونکہ ہر شعر، ہر نثر، ہر تخلیق میں زبان کا کردار ایک زندہ قوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں زبان کو ایک تہذیبی زیور کی مانند سجا کر استعمال کیا جاتا ہے، جہاں ہر لفظ ایک تخیلاتی کائنات کی تشکیل کرتا ہے اور ہر جملہ انسان کے فکری عروج کا نشان ہوتا ہے۔ اس زبان میں ہر لفظ کا انتخاب نہ صرف اس کے معانی بل کہ اس کے جذبات، گہرائیوں اور لطافتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس طرح، انسان کے کارناموں کی اساس صرف ان کے عمل نہیں، بل کہ وہ زبان ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات کو حقیقت کی شکل دیتے ہیں اور اپنی تخلیقات کو دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ یہ زبان ہی ہے جو انسان کو اپنی شناخت اور فکری ورثہ کا آئینہ دکھاتی ہے، اور اسی زبان کی بدولت انسان دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ سو اس روئے ارضی پر انسان کے کارناموں کی اساس زبان ہی ہے۔ شان الحق حقی اپنے مجموعۂ مضامین "لسانی مسائل ولطائف" میں لکھتے ہیں:

"زندگی کے گوناں گوں کرشمات میں سب سے عظیم کرشمہ، قدرت کا سب سے بڑا عطیہ، انسان کی سب سے بڑی اختراع۔ یہ آلۂ فکر بھی ہے اور آلۂ اظہار بھی۔ اس لحاظ سے ذہنِ انسانی کے تمام اعلیٰ ترین کمالات اور ارتقائے حیات کے تمام مظاہر اس پر مبنی ہیں۔ اس کے بغیر ان کا تصور ہی محال ہے۔"[۸]

ڈیوڈ کرسٹل زبان کے افعال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"زبان انسان کے افکار و خیالات کی ترسیل کا سب سے مفید اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے۔ یہ بات انتہائی دلچسپ ہے کہ ترسیل کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا یا کسی مقصد کے تحت مرسل الیہ (Receiver) کو پیغام دینا۔ زبان میں مبتدا ابلاغ (Service) اور مرسل الیہ دونوں انسان ہوتے ہیں اور جو پیغام دیا جاتا ہے، وہ یا تو ہوا کی لہروں کے ذریعے بول کر یا کاغذ وغیرہ پر تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔"[۶]

پنڈت برج موہن دتاتیریہ کیفی زبان کو اظہار خیال کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زبان تخیل اور خیال کو ظاہر کرنے یا مطلب ادا کرنے کا ذریعہ ہے... ہمارا مقصد ناطقہ کے ذریعے اظہار خیال سے ہے جس کا تعلق آواز سے ہے۔"[۱۰]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور جنھیں مغرب کے مشہور ماہرینِ لسانیات سے براہ راست استفادہ کا شرف حاصل ہوا، زبان کی بابت لکھتے ہیں:

"زبان خیالات کا ذریعہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے... زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گوئی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"[۱۱]

محمد حسین ہادی کے خیال میں زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتا ہے یا بن سکتا ہے۔ ان رائے میں:

"زبان ایک آئینہ ہے جس میں تخیل کی روشنی میں آب و تاب کے ساتھ پرتو افگن ہوتی ہے۔"[۱۲]

مغرب میں انیسویں صدی کے اوائل میں "لسانیات" کی سائنسی حیثیت پر گہری توجہ مرکوز کی جانے لگی، اور اس علم کے مقاصد، حدود، منصب اور طریقۂ مطالعہ کو واضح کرنے کے لیے زبان کی ماہیت اور حقیقت پر غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دور میں لسانیات کو محض ایک فن کے طور پر نہیں بل کہ ایک سائنسی طریقۂ تحقیق کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا، جس کے ذریعے زبان کے ساختی، نظریاتی اور عملی پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا جارہا تھا۔ کلاسیکی اور ادبی تناظر میں اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان صرف اظہار خیال کا ایک معمولی ذریعہ نہیں بل کہ ایک ایسا پیچیدہ نظام ہے جس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے تحقیق و تدبر کی ضرورت ہے۔ اسی وقت لسانیات کے اصول و قواعد کا تعین کیا گیا، تاکہ اس علم کو ایک مربوط اور سائنسی طریقہ کار کے تحت برتا جاسکے۔

زبان کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان انسانی عقل و فطرت کا اظہار ہے، جسے نہ صرف ایک زبانی نشانات کے طور پر دیکھا گیا بل کہ اسے ایک جاندار، متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر بھی سمجھا گیا۔ مغربی لسانی محققین نے اس بات پر زور دیا کہ زبان نہ صرف الفاظ اور جملوں کا مجموعہ ہے، بل کہ اس کا تعلق انسان کے فکری عمل، جذباتی کیفیت اور سماجی تنظیم سے بھی ہے۔

مغرب میں انیسویں صدی کے اوائل ہی سے "لسانیات" کی سائنسی حیثیت کی طرف توجہ دی جانے لگی اور لسانیات کے منصب، مقصد، وسعت، حدود اور طریق مطالعہ کے تعین کے لیے زبان کی ماہیت اور حقیقت پر غور و فکر ہونے لگا چنانچہ زبان کی تعریف کی طرف خاطر خواہ توجہ دی گئی۔ اور لسانیات کو محض ایک ادبی یا ثقافتی مطالعہ کا شعبہ نہیں بل کہ ایک ایسا علم سمجھا جانے لگا جو انسانی فہم، شعور اور تہذیب کی تفہیم میں مددگار ثابت ہو۔ یہ ایک نیا زاویہ تھا، جس نے زبان کو انسانی زندگی کے مرکز میں رکھ کر اس کی نوعیت، مقصد اور افادیت کا گہرائی سے تجزیہ کیا۔ جیسا کہ آرچی بالڈ اے ہل (Archi Bald a Hill) کی پیش کردہ تعریف زبان کی مجموعی صفات کا احاطہ کرتی ہے وہ کہتا ہے:

"زبان انسانی عمل کی ابتدائی لیکن خاصی مکمل صورت ہے۔ اس کی علامتیں اعضائے نطق سے ادا ہونے والی آوازوں سے تشکیل پاکر پیچیدہ لیکن متوازن ساخت کو جنم دیتی ہیں۔ علامتوں کے سیٹ (Sets) کو زبان کے وجود سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ان سے معنی و مطلب مراد لیے جاتے ہیں لیکن علامت اور معنی کا باہمی ربط اور رشتہ حقیقی و منطقی نہیں ہوتا بل کہ اختیاری، مفاہمانہ اور متفق علیہ ہوتا ہے... زبان کی ساخت اتنی کامل اور اجزا اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ بولنے والے کے لیے ہر قسم کی ذہنی و جذباتی تجربوں کو لسانی سانچوں میں ڈھالنے کے امکانات مہیا ہو جاتے ہیں۔"[۱۳]

زبان کی مجموعی صفات کے باوجود زبان یا "لسانیات" کی اصطلاح کی کوئی جامع و مانع تعریف پیش کرنا خاصا دشوار ہے۔ لغوی اعتبار سے لسانیات زبان کی ابتدا، ارتقا اور اس کی تشکیل کے قانون کا علم، زبان کی تاریخ کا علم ہے۔[۱۴] شان الحق حقی کے مطابق "لسانیات: انسانی بولیوں کا تحقیقی و تقابلی مطالعہ" ہے[۱۵] قومی اردو لغت میں لسانیات کے معنی "علم زبان کے متعلق (مسائل یا امور وغیرہ) علم اللسان، زبان کی تاریخ اور تشکیل وغیرہ کا علم، علم زبان" کے ہیں۔[۱۶]

عہد حاضر میں لسانیات زبان کے سائنسی مطالعے کو کہا جاتا ہے۔ Oxford Advanced Dictionary میں لسانیات کی تعریف سائنسی فکر کے حوالے سے ہی اس طرح کی گئی ہے

"Linguistics: The scientific study of language or of particular language, a course in applied languistics."[۱۷]

لسانیات کو سائنسی حیثیت حاصل ہونے کے بعد آج یہ زبان کا ایک سائنسی اور معروضی مطالعہ بن چکی ہے، جو مسلسل ارتقا کے عمل سے گزر رہی ہے اور اس کی تشکیل میں مختلف گروہی ثقافتوں اور تمدنوں کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ لسانیات کا یہ نشو و نما کا عمل یونان سے آغاز ہوا، جہاں ابتدائی طور پر زبان کے فنی اور نظریاتی پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ پھر روم میں اس علم میں مزید ترقی ہوئی، اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ لسانیات کے علم کو بھی ایک نیا فروغ حاصل ہوا۔ طباعت اور اشاعت کی سہولتوں نے لسانی تحقیق کو نہ صرف آسان بل کہ تیز تر بھی بنادیا، جس کے نتیجے میں غیر ملکی زبانوں کے مطالعے کے لیے مواد بآسانی

ہے اور معاشی تبدیلیوں اور سیاسی تبدیلیوں کے تناظر میں زبان میں فکری تبدیلیوں آتی ہیں جن کی بنیاد پر نئے لسانی رجحانات جنم لیتے ہیں۔ گویا زبان کی سماجیات کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سماج کے ذیلی ڈھانچے میں تبدیلیاں کس قسم کے سیاسی، مذہبی نظام کو استوار کر رہی ہیں۔[۲۱]

اردو زبان کی بھی یہی صورت حال ہے اردو کا بھی سماج سے گہرا تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی رشتہ ہے۔ سبط حسن اپنے مضمون "مسئلہ زبان اور قومی تقاضے" میں لکھتے ہیں کہ علمِ لسانیات ہماری ایک اہم قومی ضرورت ہے۔ علمِ لسانیات سے ناواقفیت کی بنا پر ہماری تہذیب روبہ زوال ہے۔[۲۲]

تاریخ کے صفحات پر اردو کے مختلف ناموں کا ذکر ملتا ہے، جیسے ہندی، ہندوی، دہلوی، ریختہ، دکنی، گجری، کھڑی بولی، ہندوستانی وغیرہ، جو اس زبان کی تاریخ اور ترقی کے مختلف ادوار کو بیان کرتے ہیں۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چوں کہ اردو مختلف لسانی تہذیبوں کے امتزاج سے ابھری ہے، اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں، جو اسے ایک منفرد لسانی رنگ عطا کرتے ہیں۔ جب آریہ وسط ایشیا کے میدانوں سے ہجرت کر کے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں، تو انھوں نے مقامی باشندوں کو جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور خود پنجاب اور گنگا کے کنارے آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں ان آریہ ہندوؤں کی زبان سنسکرت تھی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ سنسکرت بگڑ کر پراکرت ہو گئی۔ مولوی عبدالحق کے مطابق، پراکرت میں ہونے والی تبدیلیاں بالآخر برج بھاشا تک پہنچیں۔ چناں چہ جب مسلمان ہندوستان آئے تو سارے شمالی ہند میں برج بھاشا ہی بولی جاتی تھی جو کہ نہایت شیریں زبان تھی۔ مسلمان ہندوستان میں قدم جمانے لگے۔ پہلے پٹھان اور پھر مغلوں کی بادشاہت ہوئی، ان لوگوں کی زبان فارسی تھی اور فارسی میں بہت سے عربی اور ترکی الفاظ ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی فارسی اور ترکی کے الفاظ برج بھاشا میں ملنے لگے۔ مغلوں کے دور میں یورپ کی کچھ اقوام نے ہندوستان کا رخ کیا، جس کی وجہ سے کچھ پرتگالی اور فرانسیسی الفاظ بھی برج بھاشا میں شامل ہوئے۔ اس طرح، مغلوں کے عہد میں، اور خاص طور پر شاہجہان کے دور میں، برج بھاشا کی ساخت میں اتنی تبدیلیاں آئیں کہ اس کی پہچان مشکل ہو گئی۔ اردو کی اس ساخت، ترقی اور تبدیلی کا یہ عمل دسویں، گیارھویں صدی سے سترھویں، اٹھارھویں صدی تک ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو اور مسلمان ایک مشترکہ تہذیبی اور لسانی ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس تہذیبی و معاشرتی اشتراک اور نئی تاریخی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت جو زبان پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کئی ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ اس دور میں اس زبان کو کئی ناموں سے پکارا جانے لگا، جیسے اردوئے معلیٰ، جو شاہجہان کے عہد میں "قلعہ معلیٰ" کی مناسبت سے کہا گیا۔ عام زبان "ہندوستانی" کے نام سے جانی جاتی تھی، یہ زبان "ہندوستانی" کے نام سے بھی جانی جانے لگی، خاص طور پر بازاروں میں جہاں لوگ لین دین اور تجارت کے معاملات میں ابلاغ کی مجبوریوں سے ایک ملی جلی زبان بولنی پڑتی تھی۔ یہی وہ دور تھا جب اردو ایک نوزائیدہ زبان کے طور پر ابھری اور عوام کے درمیان رابطے کی زبان بن گئی۔ اس کے علاوہ یہ سنتوں اور صوفیوں کی زبان بھی بن گئی تھی۔ کیوں کہ عوام کے دلوں تک پہنچنے کے لیے نہ تو سنسکرت کا استعمال کیا جاتا تھا نہ فارسی کا، جو عمومی طور پر اشرافیہ کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ بل کہ کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو جو مختلف طبقوں اور گروپوں کے درمیان رابطے کی سہولت فراہم کرے ؛عام فہم ہو اور جو سب کی سمجھ میں آ سکے۔[۲۳] ۔ یہی وہ زبان تھی جسے ہم آج "اردو" کے نام سے جانتے ہیں، اور یہ زبان نہ صرف مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا حسین امتزاج بن گئی، بل کہ اس میں ادب، فنون اور علوم کا ایک وسیع ذخیرہ بھی سمویا گیا۔ اردا زبان کا پہلا سنہری دور حضرت امیر خسرو کا دور ہے۔ حضرت امیر خسرو کی شخصیت اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے، بل کہ ان کی تخلیقات نے اردو زبان کی بنیاد رکھ کر اسے ترقی کی راہوں پر گامزن کیا۔ اسی لیے اردو ادب میں لسانی و ادبی روایت کا پیشرو حضرت امیر خسرو کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) نے گیارہ سلاطین کا زمانہ حکومت دیکھا، نگر نگر کی سیر کی، مختلف زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان سب میں شعر گوئی کی مہارت حاصل کی تھی۔ امیر خسرو کی ابتدائی زبان، جسے آج ہم اردو کی ابتدائی شکل مانتے ہیں، ہندوی تھی۔ اس زبان میں وہ بچپن میں بولتے تھے اور یہ ان کی ابتدائی زبان تھی، جس سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ عربی زبان کے ذریعے انھوں نے اسلامی تصوف، قرآن، حدیث، اور فقہ کا گہرا مطالعہ کیا، جو ان کی شاعری اور تخلیقی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوا۔ امیر خسرو نے اپنے زمانے کے درباروں میں حضور کیا، جہاں ترکی اور فارسی زبانیں رائج تھیں۔ ترکی زبان میں ان کی دلچسپی اور میسر آنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ خیال کہ دنیا کے ہر خطے میں ادب اور زبان ہمیشہ مذہب کے اثر میں رہے ہیں، زبان کی تحقیق کے لیے ایک اہم بصیرت ہے۔ سنسکرت کا مطالعہ اس کی مقدس حیثیت کی وجہ سے رہا، کیونکہ یہ ویدوں کی زبان تھی، اور برہمنوں کی کوشش تھی کہ اس کی اصل سنسکرت کے الفاظ، عبارات اور شکل و صورت میں کوئی تبدیلی نہ آئے، چناں چہ اس کے قدیم لغات اور قواعد صرف و نحو کی تدوین اور تحقیق کی اہمیت بڑھ گئی۔

تاریخی طور پر، سب سے پہلے یونان میں افلاطون نے لسانیات پر غور کیا اور اپنی معرکۃ الآرا تصنیف کرے ٹائی لس (Crytylus) میں زبان کی ابتدا، معنی کی خصوصیت اور الفاظ کے ماخذ پر اپنے خیالات کو حرف پوش کیا اور زبان کو ایک فلسفیانہ اور نظریاتی سطح پر دیکھتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی۔[۱۸] سولھویں صدی کو لاطینی زبان کی ترقی کی معراج کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو گا۔ چرچ کی مدد سے ایک طرف لاطینی کو فروغ ملا تو دوسری طرف زبان کے قواعد و ضوابط سے متعلق مختلف خیالات پروان چڑھے۔ روم میں شروع کے ایام سے ہی لاطینی کو پڑھانے کے لیے زبان کے مطالعے پر کافی زور دیا جاتا رہا۔ جس نے اس کے تعلیمی اور دینی اثرات کو مزید تقویت دی۔ [۱۹]

اس تاریخی ارتقا نے انسان کو یہ سکھایا کہ زبان ایک سماجی اور ثقافتی مظہر ہے، جو ہمیشہ اپنے معاشرتی ماحول اور سماجی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ یعنی زبان اور معاشرتی ماحول ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جہاں زبان سماجی روابط اور ثقافتی تناظر کا عکس ہوتی ہے، اور اس کی ساخت و تشکیل میں معاشرتی حقیقتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کیوں کہ زبان کی حقیقت اور اس کا ارتقا انسان کی معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقیت تہذیبی عوامل، معاشرتی ماحول اور زبان کی فضا باہم ایک ہی ہیں۔ محمد علی صدیقی اپنی کتاب "مضامین" میں زبان کی سماجیات کے بارے میں لکھتے ہیں :

"زبان کی سماجیات کا تعلق انسانوں اور زبان کے درمیان تعلق باہمی سے ہے اور یہ تعلق ہی زبان کے Structure کی تفہیم کا اہم کام انجام دیتا ہے۔"[۲۰]

زبان کی سماجیات، زبان کا ایک نہایت اہم اور گہرا شعبہ ہے جو انسان کے معاشرتی تعلقات، تہذیبی ارتقا اور سماجی حرکات و سکنات کے تناظر میں زبان کی شکل و صورت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شاخ ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک، ایک طبقے سے دوسرے طبقے تک، اور کبھی کبھار ایک فرد سے دوسرے فرد تک زبان کے تلفظ اور معنی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں محض صوتی یا لغوی سطح پر نہیں ہوتیں، بل کہ زبان کے اسلوب، جملوں کی ساخت، الفاظ کے استعمال اور مفہوم میں بھی بظاہر معمولی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

جوں جوں تہذیب ترقی کرتی ہے، معاشرہ پھیلتا ہے، اور انسانوں کی ضروریاتِ زندگی بڑھتی ہیں، زبان میں بھی اضافے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ سماج کے مختلف رویوں سے نئے خیالات، تجربات، اور سائنسی و فنی ترقیات کے اثرات لسانی تغیرات کا روپ لیے زبان میں نئے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دوران، سماج کے مختلف رویوں اور ثقافتی پس منظر سے لسانی تغیرات جنم لیتے ہیں، جو زبان کی شکل و نوعیت میں تبدیلیاں لاتے ہیں۔

ادب میں بھی زبان کو صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بل کہ معاشرتی حقیقتوں کا ایک آئینہ سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی عہد کی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہم دراصل اُس عہد کے بولنے والوں کی سماجی زندگی، ان کے خیالات، نظریات اور معاشرتی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان کی سماجیات ہمیں اس بات کا شعور دیتی ہے کہ معاشی و سیاسی تبدیلیوں کا زبان پر کیا اثر پڑتا ہے اور کس طرح سماج کے اندر فکری تبدیلیاں اور تبدیلیوں کے اثرات زبان میں منتقل ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر، جب معاشرت میں کوئی بڑی سیاسی تبدیلی آتی ہے، جیسے کسی نئے حکومتی نظام کا قیام، تو اس تبدیلی کا اثر زبان میں بھی پڑتا ہے۔ نئے الفاظ اور اصطلاحات کا ظہور ہوتا ہے، اور زبان نئے سماجی ڈھانچے کے عکاس کے طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، مذہبی نظاموں میں تبدیلی بھی زبان میں اثر انداز ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں الفاظ اور اظہار کا طریقہ بدلتا ہے۔

لسانیاتی سماجیات کا یہ مطالعہ نہ صرف زبان کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بل کہ ایک طرف یہ ہمیں معاشرتی تبدیلیوں کی نوعیت کو بھی سمجھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف یہ زبان یا ہیہ سماجی مطالعہ درحقیقت اس زبان کے بولنے والوں کی سماجی زندگی کا مطالعہ بھی بن جاتا ہے۔۔ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح زبان، سماج کے ذیلی ڈھانچوں، سیاسی و مذہبی نظاموں اور معاشی حالات کی عکاسی کرتی

باقاعدہ اردو زبان کے اہم جزو ایہام (Ambiguity) کو ترقی اور نیا رنگ دیا جس کے اثرات دہلی میں ایہام گوئی کی تحریک کی صورت میں دیکھے گئے۔ شرف الدین مضمون، خان آرزو، رنگین، یک رنگ اور شاکر ناجی جیسے قادر الکلام شعرا سے ہوتی ہوئی شاعری کی روایت دہلی میں میرؔ و سوداؔ تک پہنچی۔ دہلی میں ایہام گوئی نے نہ صرف شاعری کو ایک نیا رخ دیا بل کہ اس نے زبان کو بھی فنی طور پر نکھارا۔ ایہام گوئی کی تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں زبانوں کے مختلف رنگ اور لسانی بوقلمونیاں منظر عام پر آئیں۔ شاعری میں بناوٹ، تصنع، اور لفظی پینترے بازیوں کے باوجود اس تحریک نے اردو زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ اس نے زبان کی فنونِ لغت نگاری کی طرف بھی رہنمائی کی اور مختلف زبانوں کے خزینے کو تلاش کرنے کا شوق پیدا کیا۔ یہی وہ دور ہے جب اردو زبان میں تحقیق لفظی کی روایت سے یہ علمی اور ادبی زبان میں تبدیلی کے عمل سے گزرنے لگی۔

خان آرزو، جو لسانیات کا منجھا ہوا ذوق رکھتے تھے، نے اردو زبان کی لغوی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب "نوادر الالفاظ" کو اردو لغت سازی کی ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مرتبہ "سراج اللغات" اور "مُثمِر" بھی بنیاد بن گئی جن میں انھوں نے گہری لسانی بصیرت سے اشتقاقیات (Etymology) پر نظر ڈالی ہے، یوں نے زبان کے ایک نئے ذائقے کو جنم دیا۔ "نوادر الالفاظ" اور دیگر لسانی کتب سے اردو زبان کے مختلف محاورات، اصطلاحات، اور الفاظ کے معنی واضح ہوئے اور ان کے استعمال کو علمی استحکام ملنے لگا۔ ان کی تحقیق نے اردو لغت کی دنیا کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ "نوادر الالفاظ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحریک کی بنیاد رکھی۔ ہندوستانی فیلالوجی کے ابتدائی قواعد واضح کیے اور زبانوں کی مماثلت دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔"[۲۷]

یہ تمام کوششیں اردو زبان کی ترقی اور اس کے جمالیاتی و لسانی اصولوں کے ارتقاء کی طرف ایک قدم ثابت ہوئیں۔ ایہام گوئی نے اردو شاعری کو ایک نیا زاویہ دیا، جب کہ خان آرزو جیسے لسانی ماہرین نے زبان کی گہری تحقیق کے ذریعے اسے مزید پختہ کیا۔ اس سلسلے کی اہمیت صرف شاعری تک محدود نہیں رہی، بل کہ اس نے اردو ادب کے دوسرے شعبوں جیسے لغت سازی، نثر نگاری، اور لغوی تحقیق کو بھی نئی جہت دی۔ جس سے لسانی ترقی کا عمل تیز ہونے لگا۔ اس حوالے سے "نوادر الالفاظ" کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے ملاحظہ کیجیے:

..."خان آرزو نے جس انداز میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا تقابل کیا یہ مروج لسانی اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ انہوں نے تلفظ اور املا کے بارے میں دقت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے عوامی استعمال کی بجائے اہل زبان کے تلفظ اور املا کو بنیاد بنایا اور اس عہد میں اردو کا ایسا مستند لغت لکھا جس کی لسانی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔"[۲۸]

لسانی شعور کی پختگی نے اردو ادب میں زبان کی اصلاح کی تحریک کو جنم دیا، جس کا مقصد اردو زبان کو زیادہ معیاری، فصیح، اور تخلیقی سطح پر مضبوط بنانا تھا۔ اس تحریک کا آغاز زبان کے نامانوس اور پیچیدہ الفاظ و تراکیب کو صاف اور سادہ بنانے کی کوششوں سے ہوا، تاکہ ادب میں زبان کا استعمال زیادہ موثر اور بامعنی ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے ایسے الفاظ اور تراکیب سے گریز کیا گیا جو معیاری ادب کی زبان کے مطابق نہیں تھے۔ اس اصلاحی عمل میں پیچیدہ اور غیر ضروری الفاظ کو ہٹا کر سادہ، صاف اور موثر زبان کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ اصلاحی عمل ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا، مختلف شعرا اور ادیبوں نے اس عمل میں اپنی اہم کوششیں کیں، جس کا اثر اردو کی زبان و ادب پر طویل المدت طور پر پڑا۔ بالخصوص مرزا مظہر جانِ جاناں، شاہ حاتم، میرؔ، سوداؔ، آتشؔ، اور ناسخؔ جیسے شاعروں نے اردو کو لسانی اور اسلوبی اعتبار سے نکھارنے کی کوشش کی۔ میرؔ اور سوداؔ نے اپنی شاعری میں زبان کی سادگی اور خوبصورتی کو سامنے رکھ کر اردو زبان کی بناوٹ کو صاف اور دلنشین بنانے کے لیے اپنے کلام میں بہتری کی، جس کے نتیجے میں اردو شاعری کو ایک نیا معیار حاصل ہوا۔ ان کی شاعری نے زبان کو ایک ادبی اور تخلیقی سطح پر نکھارا۔ آتشؔ اور ناسخؔ نے بھی اپنی شاعری میں اصلاح زبان کو جاری رکھا اور اپنے کلام میں زبان کی جملہ ساخت اور اسلوب پر خصوصی توجہ دی، تاکہ ان کی شاعری معیاری، سلیس اور دل کش ہو۔ اصلاح زبان کے اس مسلسل عمل نے تحریک کی صورت اختیار کر لی چنانچہ مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم سے لے کر میرؔ و سوداؔ اور آتشؔ و ناسخؔ تک عہد بہ مہارت ان کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات کی عکاسی کرتی ہے، جب کہ فارسی زبان میں ان کی شاعری نے انھیں عالمی شہرت دی۔ اس سے ہٹ کر امیر خسرو کی ادبی بصیرت میں یہ خاص بات تھی کہ وہ سنسکرت اور مختلف مقامی بولیوں سے بھی آشنا تھے۔ اس سے انھیں نہ صرف ہندوستانی ثقافت کو سمجھنے کا موقع ملا، بل کہ انھوں نے اپنے کلام میں ان بولیوں کا استعمال کر کے اردو کے اشعار کو ایک نیا رنگ دیا۔ یہ تمام زبانیں اور ان کا گہرا تعلق امیر خسرو کی شاعری کو ایک منفرد حیثیت دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ترکی، فارسی، عربی، ہندوی اور مقامی بولیوں کا امتزاج ہوتا تھا، جس سے اردو زبان کا نیا باب شروع ہوا۔ اس طرح حضرت امیر خسرو نہ صرف ایک شاعری کے ماہر تھے، بل کہ انہوں نے مختلف ثقافتوں اور زبانوں کے درمیان پل کا کام بھی کیا۔ یہاں تک کہ شاعر ہفت زبان کہلائے۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"ان کی مادری زبان ہندوی تھی، مذہبی زبان عربی، دربار اور ادبیات کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ وہ ان سب زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور بعض مقامی بولیوں سے بھی آشنا تھے اور ان سب میں شعر کہنے پر قادر تھے۔"[۲۴]

امیر خسرو کی درج ذیل ریختہ غزل ایک مستند لسانی حوالے کا درجہ رکھتی ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لہیو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

لسانی اعتبار سے اس غزل کے مطلع کا آدھا مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندوی میں ہے۔ امیر خسرو ریختہ کے روایت ساز تھے ان کا کلام اردو کے تشکیلی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ عائشہ سعید کی رائے میں:

"ان کی پہیلیوں اور دوہوں وغیرہ میں بھی لسانی تشکیل کا ایک اہم رخ ملتا ہے... ان کے بہت سے اشعار میں پوربی، بھوج پوری اور دہلوی الفاظ کی آمیزش ملتی ہے۔ مجموعی طور پر امیر خسرو کے کلام کو کھڑی بولی کا اولین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"[۲۵]

امیر خسرو کی پہیلیاں، دوہے، کہہ مکرنیاں، دوسخنے، گیت، کہاوت اور ڈھکوسلے وغیرہ ان کی لسانی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ہندی و فارسی اور مقامی زبانوں کو باہم شیر و شکر کر کے ایک نئے لسانی کلچر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں سرزمین دکن میں اردو کو علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ اردو زبان کی ترقی کے حوالے سے اس دور کی مثنویاتی ادب کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں بالخصوص ملا وجہی کی تصانیف "سب رس" اور "قطب مشتری" زبان و بیان کے جدید اسلوب کی ترجمان ہیں۔ عائشہ سعید اردو کے لسانی و فنی ارتقا کے حوالے سے مثنوی "قطب مشتری" کی کلاسیکی ادب میں اہمیت متعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ملا وجہی نے اپنی اس مثنوی میں دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ بہت سے لسانی تجربے بھی کیے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کی زبان مختلف زبانوں کے الفاظ ادا کرائے ہیں۔ اس کی حیثیت نہ صرف تاریخی ہے بل کہ یہ آج سے تقریباً چار سو سال پہلے کی تہذیب و معاشرت اور زبان و بیان کے اسلوبیاتی جوہر سے مزین و آراستہ بھی ہے..."[۲۶]

زبان و ادب کی ترقی میں سرزمین دکن کا کردار ناقابل فراموش رہا۔ جہاں ادب نواز بادشاہوں نے نہ صرف اپنی ریاست میں اردو زبان کی سرپرستی کی، اسے مختلف جہات سے فروغ دیا بل کہ اسے ایک معتبر ادبی زبان کے طور پر مستحکم کیا۔ اس کی بنیاد میں حضرت امیر خسرو کا کلام تھا، جس نے اردو زبان کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ اور جب امیر خسرو سے شروع ہونے والی ریختہ کی روایت جب ولیؔ دکنی تک پہنچی تو عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے نامور غزل گو اور مثنوی گو شعرا سے خاصا مستحکم بنا چکے تھے۔ ولی نے دکنی اور فارسی روایات کو ایک ساتھ ہم آہنگ کر کے باہم شیر و شکر کیا، اردو کو ایک نیا جمالیاتی رنگ دیا، زبان کی شیرینی میں اضافہ کیا اور اردو زبان کو ایسا نکھار عطا کیا جس کے اثرات ولی کے بعد بھی دو صدیوں تک اردو زبان پر ثبت رہے۔ ولیؔ کے بعد شاہ حاتم نے اردو کو اپنے کلام کا جوہر بنایا۔ ان کے تخلیقی تجربات سے زبان میں ایسا نکھار پیدا کیا، جس کا اثر دو صدیوں تک اردو زبان کی صورت گری پر دکھائی دیا۔ ان اثرات نے

تراکیب کو اہمیت دے کر ہماری توجہ سماجی لسانیات کی جانب مبذول کرائی۔ یوں "دریائے لطافت" نے اردو ادب میں سماجی لسانیات کی ضرورت کو اُجاگر کیا، اور انشاؔ نے زبان کی ساخت، محاوروں، روزمرہ کی باتوں اور مقامی لہجوں کے استعمال کو ایک ادبی و فنی زاویے سے پیش کیا۔ انشاؔ کی فنی بصیرت صرف یہاں تک محدود نہیں تھی۔ وہ علوم متداولہ کے علاوہ صرف و نحو، لغت و لسانیات، علم عروض اور محاورات پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں زبان کی دقّت و نزگسیت اور عبارات کی لطافت کا گہرا تاثر پایا جاتا ہے۔ "دریائے لطافت" اردو زبان و قواعد پر پہلی جامع کتاب ہے جسے کسی اہل زبان نے تحریر کیا، اور اس کے ذریعے انشاؔ نے اردو زبان کے لسانی ارتقاء کو ایک نیا موڑ دیا، روزمرہ کے استعمالات، اور طبقات کے درمیان لسانی فرق کو واضح کیا اور اردو ادب کے لسانی معیار کو سماجی تناظر میں ایک نیا شعور عطا کیا۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "دریائے لطافت" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار اردو زبان کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کے قواعد و اصول بیان کیے گئے ہیں... اسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اردو ایک الگ زبان ہے جو عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کے اثرات کے باوجود اپنی الگ شخصیت اور اپنا الگ مزاج رکھتی ہے۔"[۳۱]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اردو زبان کی لسانی ترقی اور ثقافتی تبدیلی کے حوالے سے اہم پیش رفت سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں ہوئی۔ اس تحریک نے نہ صرف سائنسی سوسائٹی کے قیام کے ذریعے علمی ترقی کی راہ ہموار کی بل کہ اردو ہندی تنازعہ کے دوران اردو اور ہندی کو الگ الگ زبانوں کی حیثیت میں شناخت دی۔ اس لسانی تبدیلی کے دور میں غالب کا شعری تجربہ ایک سنگِ میل کی مانند رہا، اسی سبب لسانی ترقی اور تبدیلی کے اس دور میں سب سے کامیاب لسانی تجربے غالب کے ہاں نظر آتے ہیں کیوں کہ غالب اس ادبی ماحول کا حصہ تھے جہاں بلند پایہ علما، حکما اور شعرا موجود تھے۔ غالب نے جو لسانی اور فنی اثرات جذب کیے، وہ ان کے وقت کے علمی، ادبی، اور ثقافتی ورثے سے آراستہ تھے۔

غالب کے کلام میں اس وقت کے شعری لسانی تجربات کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ لسانی تبدیلیوں کے اس دور میں بیدلؔ، عرفیؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ اور حزیںؔ کی فارسی شاعری کا ایک مضبوط اثر تھا، اور ہندوستان و ایران میں فغانیؔ کی زیرِ اثر مشکل گوئی اور مضمون آفرینی پیش کرنے کا رواج بھی فروغ پا رہا تھا۔ غالب کے عہد میں جہاں پریس کے قیام سے مطالعہ کی رغبت میں اضافہ ہونے سے ذوق مطالعہ کو وسعت مل رہی تھی، وہیں ولیؔ دکنی کے دیوان کی آمد سے اردو ادب کی شعری روایت ایک متوازن راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ اور دیگر شعرا کے یہاں ادب، تہذیب اور تخلیق کی سطح پر ایک نوع کی ہم آہنگی اور اشتراک نظر آتا ہے۔

میر، سودا، مصحفی، خواجہ میر درد، آتش ناسخ اور جرأت اور ان سے بھی پہلے ولی اور سراج کی شاعری میں غزل کی صنف کو اعتبار مل چکا تھا۔ غالب نے ان سب سے شاعری کی روایت وراثت میں پائی، اس میں ہر قسم کے اسلوب اور رویوں کا استعمال مکمل طور پر ہو چکا تھا۔ انھوں نے آنے والی تہذیبوں اور بدلتی ہوئی اقدار کی بازگشت کو محسوس کیا اور اس طرح انھیں شعوری طور پر ان چیزوں کا ادراک تھا جو ابھی پردۂ اخفا میں تھیں۔[۳۲] یہی وجہ ہے کہ غالب کے بیشتر اشعار معنویت اور لفظیات کے اعتبار سے ایسے ہیں جو ان سے پہلے کسی شاعر کے لیے کہنا ممکن نہ تھے۔[۳۳] غالب زبان کو فصاحت کی ایک نئی سند عطا کی۔ انھوں نے دکنی اسلوب کو ترک کیا اور فارسی ادب کی اعلیٰ روایت سے استفادہ کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غالب کے عہد میں فارسی شعرا، خاص طور پر عرفیؔ، نظیریؔ، ظہوریؔ، فیضیؔ اور بیدلؔ، پیچیدہ خیالات اور اسالیب کو اختیار کرتے ہوئے شعری بیان میں نئی جہتیں شامل کر رہے تھے۔ ان کے زیرِ اثر تازہ گوئی، متحیر کرنے کے لیے پیچیدہ خیالی اور اسالیب بیان کی ندرت نے ایک نئے رجحان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جس کے زیر اثر ان شاعروں نے کلام میں نئے علائم و رموز، پیچیدہ خیالات، اور پیچیدہ اسالیب کو متعارف کرایا، اور "اندازِ بیان اور" کو شاعری کا وصف قرار دیا۔ اس طرزِ بیان کو غالب نے نہ صرف اپنایا بل کہ اس میں اپنی منفرد شناخت پیدا کی۔ غالب کے اشعار میں یہ پیچیدہ خیالات اور اسالیب بیدلؔ کی زیرِ اثر آ کر ایک جدید اور متوازن اندازِ بیان کی صورت اختیار کرتے ہیں، جس نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ جب کہ اس طرز کو فروغ دینے والوں میں بیدلؔ کا نام سرفہرست ہے۔ بقول ڈاکٹر وارث کرمانی:

> "بیدل اور اس کے ساتھیوں نے... دانستہ طور پر ژولیدہ بیانی اور ابہام سے کام لے کر فارسی غزل کو زیادہ معنی خیز اور تہہ دار بنا دیا... بیدل نے مشکل بندشوں، مبہم

عہد اِس دور کے سب شعرا کی تخلیقات میں اردو زبان کو لسانی و اسلوبی اعتبار سے نکھار عطا کرنے کی شعوری کاوشیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں زبان کا معیار بلند ہونے سے اردو کا ادبی اظہار کو زیادہ پُر اثر ہو گای۔ مولانا آزاد نے اپنے مشہور کتاب "آب حیات" میں اس اصلاحی تحریک کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اصلاحات اردو ادب کے لیے نہایت ضروری تھیں اور ان کا اثر طویل المدت ہو گا۔ مولانا آزاد کے مطابق یہ اصلاحات اردو زبان کو زیادہ واضح، صاف اور سنجیدہ بنائیں گی، جس سے ادب میں نیا جذبہ پیدا ہو گا اور اس کا اثر مختلف نسلوں پر پڑے گا۔ مولانا آزاد" آب حیات" دوسرے دور کی تمہید میں ان اصلاحی کاوشوں کی بابت لکھتے ہیں:

> "ان کی اصلاح نے بہت سے لفظ ولیؔ کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی بھلہ رے اور گھیرے گھیرے اور مرے ہے بجائے مرتا ہے اور دوانہ بجائے دیوانہ اور میاں اور فقط جان کا لفظ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخر بن اس کی جگہ جان جاں، یا جانا، یا یار یا دوست یا دلبر وغیرہ بولنے لگے مگر موہن دور دوم میں نہ رہا۔ سجن رہا اور بل گیا یعنی جل گیا یعنی صدقہ گیا اور من بجائے دل بھی ہے۔" [۲۹]

اِس لسانی شعور کی پختگی اور زبان کی اصلاحی تحریک نے اردو زبان کے معیار کو بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اسی عہدِ زریں میں دہلی اور لکھنؤ کے ادبی حلقوں نے اردو زبان کی تہذیبی اور فنی ساخت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان محافل میں زبان کو محض ایک وسیلۂ اظہار نہیں سمجھا گیا بل کہ اسے ایک تخلیقی، فنی اور ثقافتی آلہ کے طور پر دیکھا گیا، جس کے ذریعے ادب کو سلیقہ، نزاکت اور جدت بخشی گئی۔ اس کا اثر نہ صرف شعراء کے کلام پر پڑا، بل کہ یہ تحریک اردو ادب کی ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی، جس نے زبان کو مزید پختہ اور تخلیقی بنایا۔ مصحفیؔ، جراتؔ اور انشاؔ جیسے شعرا نے اپنی تخلیقات میں اردو کے الفاظ کی دُرستی اور نزگسیت پر خاص توجہ دی، جس سے اردو ادب میں ایک نئی روانی اور چاشنی پیدا ہوئی۔ ان شعراء نے زبان کی ساخت میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ ان کے اشعار آج بھی اردو ادب کے معیاری نمونوں میں شامل ہیں۔

اس اصلاحی تحریک نے اردو ادب کو ایک نیا شعور دیا، جس میں الفاظ کی پختگی، جملوں کی ربط اور اسلوب کی نفاست کی اہمیت بڑھ گئی۔ زبان میں صرف اظہار کی صلاحیت نہیں بل کہ اس کی ساخت، آہنگ اور جاذبیت کی اہمیت بھی اجاگر ہوئی۔ اس کا اثر نہ صرف شاعری بل کہ نثر اور دیگر ادبی اصناف پر بھی پڑا، اور اردو ادب میں ایک نیا معیار قائم ہوا، جسے آج تک تسلیم کیا جاتا ہے۔

امام بخش ناسخ کی کاوشیں اس تحریک کا ایک نہایت اہم پہلو ہیں۔ ناسخ نے اردو زبان کے فنی اور لسانی پہلوؤں کو نئی جہت دی۔ ان کی شاعری میں زبان کی صوتیاتی خصوصیات، آہنگ اور تنغیم کو ایک نئی شکل دی گئی۔ انہوں نے اپنے پختہ لسانی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے پہلی مرتبہ صوتیات اور آہنگ لفظی جیسے مسائل زبان کو موضوع بنایا اور اردو کے کلام میں ایسی فصاحت و بلاغت کو متعارف کرایا جو اس سے پہلے نایاب تھی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں اردو زبان کے معیار میں ایک انقلابی تبدیلی آئی جس نے اس کی ساخت کو مضبوط کیا اور اس میں نیا جمالیاتی وزن پیدا کیا۔ ناسخ کی یہ ادبی آواز اولین بار اردو شاعری میں گونجی جب ناسخ نے الفاظ کی پُرکشش تشکیل اور ان کے آہنگ کو نہ صرف زیبائش دی بل کہ لسانی جمالیات کے نِکھار کو بھی اجاگر کیا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مطابق، ناسخ کا یہ لسانی شعور اور فنی بصیرت اردو زبان کو نئے امکانات فراہم کرنے کا باعث بنی، اور ان کی اصلاحات نے اردو ادب کو عالمی سطح پر اپنی اہمیت و وقار قائم کرنے میں مدد دی۔

بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

> "ناسخ کا اصلی کارنامہ ادبی یہی ہے کہ انہوں نے ادبی زبان کی تصحیح و توسیع کے لیے خاص کوشش کی ہے اور شستہ مذاق کی تشفی کے لیے الفاظ کے نقل و گرانی اور حروف کی صوتی خوبیوں اور خرابیوں کے توضیحی اصولوں پر خاصا زور دیا ہے... انہوں نے ایک طرف شاعری کو صحت لفظی سے پیوند دیا اور دوسری طرف شاعرانہ ذوق کو ناگوار آوازوں سے بچا کر صوتِ خوش اور لفظِ درست کا ربط قائم کیا۔"[۳۰]

عہدِ زریں میں انشا اللہ خاں انشاؔ کا ادبی مقام بے مثل تھا، اور ان کی تحریر "دریائے لطافت" نے اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کی۔ انشاؔ نے اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اردو زبان کی خوبصورتی اور لطافت کو اجاگر کیا بل کہ مقامی بولیوں اور مختلف طبقات کے مکالموں اور روزمرہ کی زبان اور الفاظ و

طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں دیوان جمع ہو گیا، آخر جب تمیز آئی، اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حالِ میں رہنے دیے۔"[۳۶]

یہ اعتراف دراصل غالبؔ کی خود آگاہی اور شعری ارتقاء کی دلیل ہے۔ یہ تبدیلی محض اسلوبیاتی نہ تھی، بل کہ غالبؔ کی فکری کائنات میں ایک بڑی تبدیلی کی علامت تھی—ایک ایسی دنیا جس میں باطن کا اضطراب، فلسفیانہ تفکر، اور انسانی وجود کا المیہ مرکزی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

ان بیاضوں کا مطالعہ ہمیں اس نکتہ پر پہنچاتا ہے کہ غالبؔ نے طرزِ بیدلؔ کو ترک تو ضرور کیا، مگر اس کے فکری نقوش ان کی شاعری میں تاحیات موجود رہے۔ بعد کے دور میں، جب ان کی شاعری سادہ گوئی، تہہ داری، اور جذبہ و خرد کے امتزاج کا پیکر بن کر ابھری، تب بھی بیدلؔ کے عرفانی و فکری اثرات کسی نہ کسی صورت میں غالبؔ کے اشعار میں موجود رہے۔

غالبؔ نہ صرف اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے عظیم وارث تھے، بل کہ انہوں نے اس روایت کو جدید معنویت بھی عطا کی۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے اپنی نارسائی کو خود شعری موضوع بنایا، اور اسی نارسائی سے اک نئی کائناتِ معنی تراشی۔ ان کا یہ فنکارانہ سفر ہمیں صرف شاعری ہی نہیں، بل کہ فکری و جمالیاتی تہذیب کی نئی منزلوں سے بھی آشنا کرتا ہے۔

مولانا حالیؔ غالب کے ابتدائی رنگِ سخن کا لسانی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرزا کے ابتدائی ریختہ میں... جیسے خیالات اجنبی تھے۔ ویسے ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروفِ ربط اور توابع فعل جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں ان کو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔"[۳۷]

مرزا غالبؔ اپنے آغازِ سخن ہی سے معنی آفرینی، جدتِ بیان اور ندرتِ خیال کے قائل تھے۔ ان کی فطرت میں محض تقلید نہیں، بل کہ تجربہ، تخلیق، اور انفرادیت کی جستجو پنہاں تھی۔ وہ ہر روایت کو نئے اسلوب اور تازہ زاویۂ نظر سے دیکھنے اور برتنے کا داعیہ رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ غالبؔ کی شاعری، خصوصاً ان کا تخیل—جس میں کائناتی وسعت، فکری عمق اور داخلیت کی گہرائی پائی جاتی ہے—رائج الوقت غزل کے محدود سانچوں میں مقید نہ رہ سکی۔

غالبؔ کی شاعری میں جو بلند پروازیِ فکر اور وسعتِ نظر نظر آتی ہے، وہ اس وقت کی مروجہ غزل کی ظاہری عشقیہ کیفیت، لطیف جذباتیت اور روایتی مضامین سے کئی درجہ آگے کی چیز تھی۔ چنانچہ غالبؔ نے محض طرزِ اظہار ہی میں تجدید نہ کی، بل کہ صنفِ غزل کو نئی معنویت، فکری گہرائی، اور ذہنی کائنات کی وسعت سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے غزل کو محض عاشق و معشوق کے مابین وارداتِ دل کی محدود روایت سے نکال کر انسانی وجود، کائناتی سوالات، تضادِ احساسات اور فلسفیانہ تجربات کے اظہار کا موثر ذریعہ بنایا۔

ان کا یہ تخلیقی تجربہ اس امر کی دلیل ہے کہ غالبؔ محض اردو غزل کے ایک اور شاعر نہ تھے، بل کہ وہ اس صنف کے مجدد، مبدع اور مسافرِ نوافق تھے۔ انہوں نے غزل کو ایک نئے فکری افق سے ہم آہنگ کر کے اس صنف کو سائبانِ عرفان و وجدان میں بدل دیا، جہاں ہر شعر اپنے باطن میں ایک مکمل کائنات رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری میں جو بلند پروازیِ فکر اور وسعتِ نظر نظر آتی ہے، وہ اس وقت کی مروجہ غزل کی ظاہری عشقیہ کیفیت، لطیف جذباتیت اور روایتی مضامین سے کئی درجہ آگے کی چیز تھی۔ چناں چہ غالبؔ نے محض طرزِ اظہار ہی میں تجدید نہ کی، بل کہ صنفِ غزل کو نئی معنویت، فکری گہرائی، اور ذہنی کائنات کی وسعت سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے غزل کو محض عاشق و معشوق کے مابین وارداتِ دل کی محدود روایت سے نکال کر انسانی وجود، کائناتی سوالات، تضادِ احساسات اور فلسفیانہ تجربات کے اظہار کا موثر ذریعہ بنایا۔ تخلیقی تجربات کے اس عمل سے انھوں نے اپنے لیے ایک نیا جہان پیدا کیا اور صنف غزل کو بھی اپنی فکر و خیال کے حسن امتزاج سے معراج بخشی۔ غالبؔ کا یہ انقلابی اسلوب بعد کے تمام شعراء کے لیے فکری بیداری اور تخلیقی آزادی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ ان کی غزل محض شعری کلام نہیں، بل کہ فکری تجلی، احساسی بصیرت اور وجودی سوالات کا ایک بھرپور اظہار ہے—ایسا اظہار جو آج بھی قاری کو فکر کی نئی راہوں پر لے جاتا ہے۔ اسی فکری و فنی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین خیالات اور مابعد الطبیعیاتی تصورات کو سمو کر خیال انگیزی پیدا کی۔ بیدل کے ساتھ فارسی غزل ایک سنجیدہ اور فکر انگیز دور میں داخل ہوتی ہے۔"[۳۴]

غالب کا شعری عہد ایک ایسا دور ہے جس میں ان کی فارسی پسندی اور زبان سے گہرا تعلق نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ غالب نے ۱۸۱۳ء سے لے کر ۱۸۲۱ء تک جو شاعری تخلیق کی، وہ نہ صرف ان کی فارسی زبان پر عبور کا مظہر تھی، بل کہ اس عرصے میں غالب کی فارسی سے بے پناہ محبت اور تعلق کا بھی غماز تھی۔ غالب کا فارسی ادب سے جو رشتہ تھا، وہ محض ایک زبانی تعلق نہیں بل کہ ایک گہری فنی وابستگی اور ادبی جذبے کا اظہار تھا۔

غالب نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں فارسی کی زبان اور اس کے ادبی اسلوب کو نہ صرف اپنا رہن سہن بل کہ اس کا ایک حصہ بنالیا تھا۔ اس زمانے میں غالب کی شاعری میں فارسی شعری روایات کی جھلکیاں اور فارسی ادب کی گہرائی کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی فارسی دانی نے انہیں ایک منفرد مقام دیا، جہاں انہوں نے اپنی شاعری میں فارسی کے خوبصورت اسالیب، آہنگ اور پیچیدہ تراکیب کا بھرپور استعمال کیا۔ فارسی زبان کا اثر غالب کی تخلیق میں اس حد تک گہرا تھا کہ وہ اس زبان کی جمالیاتی لطافت کو اپنی شاعری میں سمو چکے تھے۔

غالب کی فارسی پسندی نے ان کے کلام میں ایک مخصوص فنی رنگ بھر دیا، جو انہیں اپنے ہم عصر شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں فارسی کی تاثیر اس قدر نمایاں تھی کہ اس دور کے دیگر شعرا کے کلام میں ایسی لطافت، پیچیدگی اور تاثر کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس عہد میں غالب نے فارسی کو نہ صرف بطور ذریعہ اظہار اپنایا بل کہ اس کی شاعری کے اسلوب کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا، جس سے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور ذائقہ شامل ہوا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فارسی زبان سے غالب کے گہرے عشق اور ایران سے شغف کے سبب ان کی شعری لغت فارسی الفاظ، محاورات، تراکیب اور استعاروں سے لدی پھندی نظر آتی ہے اور اس بوجھ تلے قاری دبتا چلا جاتا ہے... ان کا متخیلہ شعری روایت کے تلازمات اور تمثالی پیکروں سے بالکل موانست نہ رکھتا تھا۔ وہ دنیا جو اس کے ارد گرد سانس لیتی تھی اس میں شاعر کے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی... اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اس کا قاری ان لفظوں کی دنیا سے کوئی معنویت بر آمد کر سکے گا یا نہیں۔"[۳۵]

بیاضِ غالب (نسخۂ امروہہ: ۱۸۱۳ء–۱۸۱۶ء) اور نسخۂ حمیدیہ (۱۸۱۷ء–۱۸۲۱ء)—جو غالبؔ کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہیں اور خود ان کے دستِ تصنیف سے مرتب ہوئے—مرزا غالبؔ کی شعری نشو و نما، فکری جہات اور فنی رجحانات کے مطالعے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں بیاضوں میں غالبؔ کی عظیم شاعر عبد القادر بیدلؔ سے والہانہ عقیدت اور اس کے شعری اسلوب کی پیروی کا رجحان پوری شدت سے جلوہ گر ہے۔ اس دور کی شاعری میں غالبؔ نے رائج الوقت سادہ گوئی، جو میرؔ، سوداؔ، ناسخؔ اور دیگر اسلاف کی روایت تھی، سے اعراض کرتے ہوئے تعمق، ابہام، اور استعارہ کی پیچیدہ فضا کو اختیار کیا۔ گویا انہوں نے خود کو محض ایک مقلد کے طور پر نہیں، بل کہ ایک جستجو کرنے والے فنکار کے طور پر پیش کیا جو خیال و اظہار کی نئی راہیں تلاش کر رہا تھا۔

تاہم یہ امر قابلِ غور ہے کہ غالبؔ کا یہ تجرباتی اسلوب ان کے عہد کے ادبی ذوق سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ اردو شعری روایت اُس وقت آسانیِ بیان، صاف گوئی، اور حسی تجربے کے اظہار کو ترجیح دیتی تھی۔ چنانچہ غالبؔ کی یہ مشکل پسند شعری طرز تنقید و تنسیخ کی زد میں آئی اور ان کی تخلیقات کو وہ عوامی اور نقادانہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ یہی وہ داخلی اور خارجی تناؤ تھا جس نے غالبؔ کو طرزِ بیدلؔ سے بتدریج الگ ہونے پر آمادہ کیا۔ چناں چہ جلد ہی طرز بیدلؔ سے رخصت لی اور ایک نئی شعری روایت کی بنیاد رکھی جس کے موجد و خاتم غالب خود ہی ہیں۔ غالبؔ نے اس انقلابی فکری و فنی تبدیلی کو نہ صرف برتا بل کہ خود بھی اس کا اعتراف کیا۔ ان کے خطوط میں وقتاً فوقتاً اس شعری تبدیلی کے اشارات ملتے ہیں، جیسا کہ اپنے اس طرز سخن گوئی کو اپنانے اور پھر اسے ترک کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبد الرزاق شاکر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل اور اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا:

سے ہٹتے ہی اردو شاعروں کو بھی وہی مقام مل گیا اور دربار، سرکار، امرا و نوابین کی ویسی ہی سرپرستی حاصل ہو گئی جو اب تک صرف فارسی گویوں کو حاصل تھی... اردو شاعری برعظیم کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ اردو زبان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے تصرف میں لا کر اس معاشرے نے نئے سرے سے خود کو دریافت کیا تھا۔"[۳۹]

گویا جب غالبؔ نے اردو شاعری کے افق پر اپنے فکری و فنی سفر کا آغاز کیا، تو وہ ایک ایسی ادبی سرزمین پر وارد ہوئے جو صدیوں کی تہذیبی روایت، شعری اثاثے اور لسانی نزاکتوں سے لبریز تھی اور جس کی ادبی مٹی زرخیز، روایات مضبوط، اور فن کی فصل تیار تھی۔ یہ ایک ایسا عہد تھا جہاں اردو شاعری اپنی کلاسیکی بلندیوں کو چھو رہی تھی، اور زبان و بیان کی جمالیات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔

تاہم، غالبؔ کی شعری عظمت محض اس امر میں نہیں کہ وہ ان موجودہ روایات کے امین بنے، بل کہ اس سے کہیں بڑھ کر انہوں نے ان روایات کو اپنے فکر و شعور، تخیّل کی گہرائی، اور طرزِ ادا کی انفرادیت کے ذریعے نئی جہات عطا کیں۔ انہوں نے کلاسیکی شعری روایت کو محض دہرایا نہیں، بل کہ اس میں اپنے مخصوص فلسفیانہ طرزِ فکر، داخلی کرب، اور کائناتی شعور کو اس انداز سے سمویا کہ اردو شاعری میں ایک نئی کائنات کی تخلیق ہوئی۔ غالبؔ نے نہ صرف زبان کو نئی تہذیب عطا کی، بل کہ معانی کی سطح پر بھی ایسا تنوع اور وسعت پیدا کی جس نے اردو غزل کو فکری اور فنی اعتبار سے ایک نئی شناخت دی جس سے ان کی شاعری کلاسیکی اقدار کی روح کے ساتھ ساتھ جدید فکری شعور کی ترجمان بھی بن گئی جس کی مدد سے انھوں نے فکری توانائی، فنی ندرت اور اسلوبی انفرادیت کا رنگ بھر کر ایک نئی شعری کائنات کی بنیاد رکھی۔

اٹھارہویں صدی کا دور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک انقلابی اور تشکیلی عہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر اور سودا کے اس عہد میں اگرچہ اردو نے فارسی زبان و ادب سے اکتسابِ فیض کیا، مگر اپنی انفرادی شناخت، فطری لہجے اور اسلوبی رنگ میں اس حد تک نکھر کر سامنے آئی کہ وہ محض ایک تابع زبان نہ رہی، بل کہ ایک جیتی جاگتی، مکمل اور معیاری ادبی زبان کے طور پر تسلیم کی جانے لگی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی بصیرت افروز رائے کے مطابق، اس دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو کی مختلف شعری و نثری اصناف میں فنی اصولوں کی باقاعدہ پاسداری کی گئی۔ زبان کی بندش میں چستی، محاورات کا برمحل استعمال، روزمرہ کی زبان کو بلند ادبی سطح پر برتنے کی مہارت، فارسی و عربی الفاظ کی تلفظ کے ساتھ درستی، صنائع بدائع کی فنی چابک دستی سے آراستگی، اور عروضی ضوابط جیسے قافیہ، ردیف اور بحور کی صحت و حسن کے ساتھ تشکیل — یہ سب عناصر اس عہد کی فنی بالیدگی اور زبان کے جمالیاتی ارتقا کا بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اس صدی میں ندرتِ بیان کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ وہ فارسی تراکیب اور اصطلاحات جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں، ان کا استعمال نہ صرف جائز سمجھا گیا بل کہ انہیں اظہار کی لطافت اور تہذیب کی علامت گردانا گیا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور کی اردو، محض عوامی یا بازاری زبان نہ رہی، بل کہ ایک تہذیبی اور ادبی اظہار کا وسیلہ بن گئی۔

یہ صدی زبان کی تشکیل و تہذیب کا ایسا عہدِ زریں ہے جس میں اردو اپنے صوتی آہنگ، نحوی ساخت اور لغوی دائرے میں مسلسل نشو و نما پاتی رہی۔ اس پوری صدی میں ادبی زبان و بیان میں اتنی تیزی سے تبدیلی آئی کہ اگر جعفر زٹلی (۱۷۱۳ء)، آبرو (۱۷۳۳ء)، یقین (۱۷۵۵ء) اور میر (متوفی ۱۸۱۰ء) جیسے شعرا کی زبان کا باہم موازنہ کیا جائے، تو یہ تبدیلی اس قدر ہمہ گیر اور عمیق محسوس ہوتی ہے کہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ محض چند دہائیوں میں زبان میں اتنی گہری اور خوش آئند تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اردو زبان نہ صرف ایک مستحکم ادبی وسیلہ بن چکی تھی، بل کہ اس کی صرف و نحو اور اصول و قواعد کی باقاعدہ تدوین کے امکانات بھی واضح ہو چکے تھے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انیسویں صدی میں لسانی تحقیق، لغت نویسی، قواعد سازی اور ادبی تنقید کا ایک نیا باب رقم ہوا۔ یوں یہ صدی اردو زبان کی تکمیل و تہذیب کا ایک ایسا سنگِ میل بن گئی جس کی بازگشت آج بھی ہماری زبان و بیان میں سنائی دیتی ہے۔ اس پوری صدی میں زبان مسلسل اپنے لہجے، آہنگ اور ذخیرہ الفاظ کے ساتھ بدلتی رہی اور میر کی وفات تک اس نے ایک ایسی معیاری شکل اختیار کر لی جو آج ہم بولتے اور لکھتے ہیں۔[۴۰] اٹھارویں صدی کے اختتام پر اردو زبان ایک ایسے مرحلے پر پہنچی نظر آتی ہے جب اس کے صرف و نحو اور حالیؔ — جو غالبؔ کے اولین اور مستند شارح و نقاد ہیں — غالبؔ کی غزل کا تقابل روایتی کلاسیکی غزل سے کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"میرؔ و سوداؔ اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں، وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ و بہ تغیر اسالیب بیان عامہ، اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ میں ادا کیے جائیں... برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مَس نہیں کیا... جب میرؔ و سوداؔ اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات و مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزاؔ کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔"[۳۸]

مرزا غالبؔ اس اعتبار سے خوش بخت اور سعید الفطرت شاعر تھے کہ ان کا ظہور اُس زمانے میں ہوا جب اردو شاعری اپنے عہدِ زریں سے گزر کر فکری و فنی پختگی کے بلند مدارج طے کر چکی تھی۔ وہ دور جس میں غالبؔ نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا، درحقیقت اردو شاعری کے ارتقائی سفر کا نکتۂ کمال بن چکا تھا۔ اس وقت تک اردو کی مختلف شعری اصناف — غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، شہر آشوب، واسوخت وغیرہ — اپنے اپنے میدان میں کمالِ فن اور عروجِ اظہار کو چھو چکی تھیں اور شاعری کی تمام اصناف کا بہترین ادب تخلیق ہو چکا تھا۔

میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کا لقب دیا جا چکا تھا اور ان کی غزل میں سوز و گداز، سادگی و صداقت اور انسانی تجربے کا جمالیاتی اظہار ایک نئی معراج کو پہنچ چکا تھا۔ خواجہ میر دردؔ نے شعری پیکر کو تصوف، معرفت اور روحانی واردات سے آشنا کر کے اسے باطنی مکاشفے کا آئینہ بنا دیا تھا۔ سوداؔ اپنے قوتِ بیان اور طنزیہ و فکری توانائی کے ساتھ ہجو نگاری اور قصیدہ گوئی کے سلطانِ سخن تسلیم کیے جا چکے تھے۔

مثنوی نگاری بھی اپنے شباب کو پہنچ چکی تھی۔ میر حسنؔ کی مثنوی سحر البیان نے عشقیہ و بیانیہ فن کی بلاغت اور زبان کی شعری تشکیل کا ایسا نمونہ پیش کیا جو اردو ادب کا لازوال ورثہ بن گیا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ جیسے فنکاروں نے فنِ مرثیہ گوئی کو بیان کی معراج، تاثر کی شدت اور واقعات نگاری کے فن سے ہم آہنگ کر کے اسے کلاسیکی ادب کی ایک بلند و بالا صنف بنا دیا۔

اسی طرح شہر آشوب جیسی صنف میں میرؔ، سوداؔ، قائمؔ، جعفر علی حسرتؔ، حاتمؔ وغیرہ نے اٹھارویں صدی کے پر آشوب واقعات اور سیاسی و سماجی آشوب کو ادبی پیکر میں ڈھالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ رباعی، قطعہ، غزلیات اور واسوخت کی اصناف بھی اس عہد میں ادبی لطافت اور اظہار کی جدت سے متعارف ہو چکی تھیں۔

اس سب کے ساتھ ساتھ، لسانی سطح پر بھی اٹھارویں صدی اردو زبان کی ترقی و تہذیب کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ اس عہد میں اردو زبان نے ارتقا کی نئی اور مشکل سیڑھیاں چڑھ لیں اور محض روزمرہ کی سطح سے اٹھ کر ادبی اظہار، فکری تہذیب، اور شعری قالب کے قابل خود کو ثابت کر دیا۔ اگرچہ اردو زبان کے لسانی خدوخال ابھی بھرپور انداز میں متعین نہیں ہوئے تھے تاہم یہ اردو زبان کی لسانی پختگی کا بھرپور نقطہ آغاز تھا اور اسی دور میں زبان کی ساخت، ترکیب، صوتیات، اور اسالیب میں ایسی تبدیلیاں آئیں جو آگے چل کر اردو کی لسانی انفرادیت کی بنیاد بنیں۔ اور اردو زبان اس منزل پر آن ٹھہری جہاں ادب، تہذیب اور لسان باہم پیوست ہو کر اردو کے قومی اور جمالیاتی کردار کو اجاگر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت اردو زبان کے خدوخال پوری طرح متعین نہ تھے، تاہم یہ وہ مرحلہ تھا جہاں سے اردو زبان کی لسانی بلوغت نے باقاعدہ آغاز کیا۔

اس منظرنامے کا گہرا لسانی و ادبی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی بجا طور پر لکھتے ہیں:

..."اس دورِ زوال میں وہ بند، جو فارسی زبان نے اردو زبان کے دریا پر باندھ رکھا تھا، ٹوٹ گیا۔ اس بند کے ٹوٹتے ہی سوکھی، پیاسی زرخیز زمین سرسبز و شاداب ہو گئی اور ادب کا رشتہ براہ راست عام آدمی سے قائم ہو گیا... فارسی زبان کے مسندِ اقتدار

در حقیقت، غالب کے مکاتیب اردو زبان کے تشکیلی اور ارتقائی مراحل کا نہایت نادر اور معتبر حوالہ ہیں۔ یہ مکاتیب جہاں ان کی علمی ژرف نگاہی کو نمایاں کرتے ہیں، وہیں زبان کو ایک زندہ، رواں اور تہذیبی طور پر متحرک پیکر کے طور پر برتنے کا عملی مظاہرہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے یہ مکتوبات صرف ادبی سرمایہ نہیں، بل کہ اردو لسانیات کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے زبان کے ماضی، حال اور ممکنہ مستقبل کی تفہیم میں گراں قدر مدد حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کی زبان دانی کا تجزیہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ:

"غالب کے فن میں زبان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ زبان کے بلند پایہ فن کار ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے زبان کے استعمال کو ایک فن بنادیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جمالیاتی اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ زندگی سے بھرپور ہے۔ اس میں بڑی جولانی ہے، بڑی جدت ہے اور تازگی ہے، بڑی شگفتگی و شادابی ہے۔ غالب نے اس کو خوب بنایا، سنوارا اور نکھارا ہے اور اس میں شروع سے آخر تک ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ہے... ان کی زبان ان کے تخلیقی مزاج کی آئینہ دار ہے... غالب نے زبان کو ایک نیا مزاج دیا ہے۔ اس کے استعمال میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے اور اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔"[۴۱]

نثر سے قطع نظر، غالب کا شعری لسانی رویہ بھی اس امر کی روشن دلیل ہے کہ وہ اپنے عہد کے بے مثل اور بصیرت افروز لفظ شناس تھے۔ اُنہوں نے زبان کی تہذیبی، سماجی اور نفسیاتی جہات کا عمیق ادراک رکھتے ہوئے نہ صرف الفاظ کے برمحل انتخاب پر توجہ مرکوز رکھی، بل کہ ان کے دروبست اور حسنِ ترتیب سے اپنے اشعار میں ایسا معنوی جادو بھر دیا جو "گنجینۂ معنی کا طلسم" بن کر قاری کے دل و دماغ کو مسحور کر دیتا ہے۔ غالب کی فطرت میں جو جدّت پسندی اور تخلیقی جرات موجود تھی، اُس نے اُنہیں روایت سے ہٹ کر مروجہ الفاظ کو نئے اور تہہ دار مفاہیم سے ہمکنار کرنے پر آمادہ کیا۔ اُنہوں نے زبان کے عام الفاظ کو اپنی جدتِ اسلوب اور شعری چابک دستی سے وہ تازگی عطا کی کہ اُن کا مختصر دیوان بھی اثر انگیزی اور فکری ندرت کا شاہکار بن گیا۔ غالب کی شعری زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، بل کہ اُن کے یہاں ہر لفظ معنی و مفہوم کی ایک پوری دنیا کا دروازہ کھولتا ہے، جس میں قاری گہرائی اور معنویت کے اسرار سے ہمکنار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حقیقت کی تصدیق اپنے ایک مضمون میں یوں کرتے ہیں کہ

"غالب کے کلام کی دل کشی و اثر پذیری اور معنوی تہہ داری میں صرف فکر و خیال کی تازگی و ندرت کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ..... اس میں زبان کے فنی برتاؤ اور الفاظ کے تار و پود کو بھی خاصا دخل ہے ان کا یہ دعویٰ ہے کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

بے دلیل نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے میں علم بیان و بدیع کے جملہ محاسن اور زبان و بیان کے سارے رموز و نکات سے کام لیا ہے۔"[۴۲]

غالب ایک ذوالسانین شاعر تھے جنہوں نے بیک وقت فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں اپنی شاعرانہ عظمت، فکری گہرائی اور لسانی بصیرت کا سکہ جما دیا۔ ان کی تخلیقات اس بات کی روشن گواہی ہیں کہ وہ نہ صرف ان زبانوں کے صرف و نحو، بلاغت اور اسالیب پر کامل دسترس رکھتے تھے، بل کہ ان کے کلام میں زبان و بیان کی لطافت، ترکیبوں کی نزاکت، اور بیان کی جدّت و شائستگی اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کی زبان دانی اور لسانی شعور کو محض اتفاقی ہنر نہیں بل کہ ایک شعوری، فکری اور فنی کمال تسلیم کیا جائے۔ غالب کی لسانی عظمت اور دو لسانی اظہارِ فن اُنہیں برصغیر کی شعری روایت میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے، جو نہ صرف اُن کے فکری ارتقا کا غماز ہے بل کہ اُن کی فطری ذہانت اور زبان پر قدرت کا آئینہ دار بھی۔ اسی تناظر میں شیخ محمد اکرام "غالب نامہ" میں رقم طراز ہیں کہ

"مرزا کی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے جس کے دو دروازے ہیں ایک اردو اور ایک فارسی...۔"[۴۳]

اصول و قواعد مرتب کرنے کے امکانات واضح نظر آتے ہیں بل کہ انھی صرفی و نحوی خصوصیات پر انیسویں صدی میں بھی توجہ مرکوز رہی۔

اردو زبان و ادب کے ارتقائی سفر میں جو انقلابی موڑ انیسویں صدی کے آغاز پر نمودار ہوا، اس کی پیشوائی کا شرف بلاشبہ میرزا غالبؔ کے حصے میں آتا ہے۔ وہ محض سابقہ کلاسیکی روایت کے امین نہ تھے، بل کہ ایک ایسے مبدع و مجتہد تھے جنہوں نے میر و سودا کے عہدِ زریں کے لسانی و تہذیبی ورثے کو ایک نئی فکری وسعت، اسلوبی انفرادیت اور تخلیقی جِلا عطا کی۔ غالبؔ نے محض ماضی کی تقلید پر اکتفا نہ کیا، بل کہ اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اردو زبان کو نئے سانچوں میں ڈھالا، اور اس کے بیانیہ، اسلوب اور ساخت کو ایسے تجربات سے ہم کنار کیا جو آنے والے زمانوں کے لیے مشعلِ راہ بن گئے۔

غالبؔ کی لسانی عظمت کا ایک بڑا مظہر ان کی شاعری کی وہ جہت ہے جہاں ان کی لفظیات، ترکیب سازی، معنویت آفرینی، صوتی آہنگ، صرفی و نحوی مہارت، لسانی تشکیلات، آہنگ شعری، املا کی صفات، صنائع لفظی و معنوی کے امکانات اور اسالیب کی تنوع پذیری اپنی مثال آپ بن جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی بصیرت نے زبان کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں رہنے دیا، بل کہ اسے ایک فن پارے کی شکل میں تراشا۔ صنائعِ لفظی و معنوی کو جس فنی چابک دستی سے انہوں نے برتا، اس نے اردو شاعری کو لسانی اعتبار سے ایک نیا افق عطا کیا۔ ان کے یہاں املا کے رموز، صوتیات کی لطافت، اور لسانی تشکیلات کا ایسا ہمہ جہت نظام ملتا ہے جو نہ صرف زبان کے حُسن کو بڑھاتا ہے، بل کہ اس کی تہذیبی معنویت کو بھی گہرائی بخشتا ہے۔ یہ وہ عہد تھا جب تہذیب تغیر پذیر تھی اور پرانی لفظیات نئی فکری و معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہو چکی تھی۔ غالبؔ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور زبان کو اس درجہ لچک اور وسعت بخشی کہ وہ نئی تہذیبی ترجیحات اور فکری مطالبات سے ہم آہنگ ہو گئی۔ ان کے لسانی تجربات کی وسعت اس قدر ہے کہ ان کی شاعری میں مشکل پسندی اور دقیق خیالات سے لے کر سادہ گوئی اور رواں اسلوب تک، ہر انداز میں زبان ایک نئے قالب میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ کامیاب اخفا سے کامیاب ابلاغ تک کا یہ سفر دراصل اردو زبان کی تہذیبی بلوغت کا مظہر ہے۔

تہذیب کو بنیاد بنا کر غالب نے لسانی ترقی کی نئی راہیں متعین کیں جن کے پس پردہ نئی تہذیبی ضروریات بھی تھیں کیوں کہ تہذیب کے بدلاؤ کا تقاضا تھا کہ لسانی عمل کو تیز کیا جائے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری کے پیرائے میں عملاً لسانی تبدیلیاں کیں بل کہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کے نام مکاتیب میں بھی باریک لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم غالب کے لسانی شعور کا بخوبی ادراک کر سکتے ہیں۔ غالب کے یہ مکاتیب اردو ادب میں محض خطوط نگاری کا ایک نیا باب نہیں، بل کہ وہ لسانی، تہذیبی، ادبی اور فکری شعور کی ایسی گراں قدر دستاویز ہیں جو اُن کے عمیق فہمِ زبان، دقیق ادراکِ قواعد، اور لسانی رموز و نکات پر کامل گرفت کا مظہر ہیں۔ یہ مکاتیب صرف شخصی و سماجی جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں، بل کہ اردو زبان کی ساخت، اس کے صرفی و نحوی اصول، صوتی و معنوی جہات اور بین اللسانی روابط کے حوالے سے ایک مستقل مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔

غالبؔ اپنے مکاتیب میں جس لسانی باریکی اور فکری گہرائی سے اظہارِ خیال کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف غالب کے مکاتیب غالب کے منجھے ہوئے لسانی شعور، فنِ شعر کے ساتھ ساتھ تہذیبی، سماجی اور نفسیاتی ضروریات کے اسرار و رموز سے واقفیت اور زبان دانی کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں وہیں دوسری جانب وہ ان کے وسیع المطالعہ، دقیق النظر اور زبان شناس ہونے کا بین ثبوت ہے۔ کسی مقام پر وہ اپنے تلامذہ کی قواعدی لغزشوں کی اصلاح کرتے دکھائی دیتے ہیں، تو کسی اور مقام پر علمِ عروض، قوافی، ردیف اور صنائعِ لفظی و معنوی پر نہایت بالغ نظری سے اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ وہ تراکیب سازی، اشتقاقیات، اور لغوی تفاعل جیسے پیچیدہ لسانی امور کو اس سلاست سے بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی زبان دانی اور فہمِ لسان کے کمالات پر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

اسی طرح وہ اردو زبان میں دخیل عربی، فارسی، ترکی اور ہندی الفاظ کی نوعیت پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے اردو زبان کے دیگر زبانوں کے ساتھ اشتراک، جذب و انجذاب، اور تبادلۂ لسانی کے عمل کو نہایت گہرائی سے واضح کرتے ہیں۔ ان کے مکاتیب میں جابجا تذکیر و تانیث، واحد و جمع، اسما و صفات، محاورات و روزمرہ، اور دیگر قواعدِ زبان کے ایسے لطیف اشارے ملتے ہیں جو ان کی باریک بین لسانی بصیرت اور قواعدِ زبان پر کامل عبور کے آئینہ دار ہیں۔

مرزا غالب نے فارسی زبان پر غیر معمولی دسترس اور عربی زبان کے رموز و قواعد سے عمیق واقفیت کے باعث اردو زبان کو ایسی ہمہ گیری اور وسعت عطا کی جو اسے محض ایک محاوراتی وسیلہ اظہار سے بلند تر ایک باوقار علمی و ادبی زبان کے مرتبے تک لے آئی۔ اُنہیں زبان کے لطیف نکات، دقیق رموز، اور لسانی اسرار پر غیر معمولی نظر حاصل تھی۔ یہی سبب ہے کہ اردو لسانیات کے طویل تدریجی سفر میں غالب سب سے زیادہ لسانی شعور کے حامل ادبی تخلیق کار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو نہ صرف زبان کے فطری و فکری پہلوؤں کو سمجھتے ہیں بل کہ اُن کی تہہ داری میں بھی غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غالب کا یہ لسانی شعور، اُن کے شعری شعور کی طرح نہایت پختہ، بالغ اور تخلیقی بصیرت سے مملو تھا۔ خصوصاً اردو غزل کے اسلوب کو سنوارنے، اُس میں فکری رفعت، اسالیب کی جدت، اور معنوی تہہ داری پیدا کرنے میں اُن کا کردار بے مثال ہے۔ اُنہوں نے اردو زبان کو فقط اظہار کا ذریعہ نہیں رہنے دیا، بل کہ اسے فنی اور فکری سطح پر نئے محاسن سے آراستہ کر کے اس کی تہذیبی و تخلیقی سرحدوں کو وسعت دی۔ غالب نے نہ صرف اردو غزل کی داخلی ساخت کو نکھارا، بل کہ اردو زبان کے لسانی امکانات کے ایسے دریچے بھی وا کیے جن سے اردو زبان ایک نئے فکری اور ادبی عہد میں داخل ہوئی۔ اُن کا کلام اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ وہ صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بل کہ ایک بلند پایہ لسانی مفکر بھی تھے۔

اردو زبان میں لسانی عمل کی تحریک، اس کے شعوری ارتقا اور تفہیم کے لیے لازم ہے کہ ہم ابتدا سے لے کر مرزا غالب کے دور تک کے ادبی و لسانی سرمائے پر گہری نگاہ ڈالیں، کیونکہ اردو زبان کے لسانی ارتقا میں محض ادبی روایات و اسالیب ہی نہیں بل کہ اس عہد کی تہذیبی روح اور تمدنی فضا بھی پوری قوت کے ساتھ اپنا عکس دکھاتی ہے۔ درحقیقت، تہذیب و تمدن کے ارتقائی مدارج کے ساتھ ساتھ انسانی فکر و احساس کے زاویے بھی بتدریج تغیر پذیر ہوتے ہیں، اور کسی مخصوص عہد کے ادبی سرمائے میں الفاظ و تراکیب سے لے کر تشبیہ و استعارہ، آہنگ و اسلوبِ بیان، صرف و نحو، رسم الخط اور معنیات تک — ہر سطح پر روحِ عصر کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

مرزا غالب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اس روحِ عصر کو گہری بصیرت سے پہچان کر اردو لسانیات کو تہذیبی پس منظر میں اس طرح جلا بخشی کہ آج اردو زبان نئی تہذیب کی ضروریات کو نہ صرف پورا کر رہی ہے بل کہ بہ طریق احسن سماج اور انسانی نفسیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتی ہوئی ہمارے تہذیبی شعور، نفسیاتی گہرائی، اور فکری ہم آہنگی کی ایک بھرپور علامت بن گئی۔ اُنہوں نے اردو لسانیات کو ایک ایسے تہذیبی تناظر میں جلا بخشی جس نے زبان کو نہ صرف نئی تہذیبی اور تمدنی ضروریات سے ہم آہنگ کیا بل کہ انسانی شعور اور معاشرتی نفسیات کے باریک ترین پہلوؤں کا احاطہ بھی کیا۔

امیر خسرو سے لے کر غالب تک، اردو لسانیات کے اس طویل سفر میں شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر جو لسانی، فکری اور تہذیبی کاوشیں ہوتی رہیں، وہ درحقیقت ایک مسلسل جدوجہد کا ثمر تھیں۔ ان ہی کاوشوں نے اردو زبان کو محض ایک ادبی وسیلہ نہیں، بل کہ ایک تہذیبی پیکر میں ڈھال دیا — اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اردو لسانیات کا تناور اور ثمر بار درخت ایستادہ ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن، نسخہ جرمن، مطبع کلاسیک، لاہور، جنوری ۲۰۰۱، ص ۱۲۰

۲۔ حیدر علی آتش، کلیات آتش، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۹، ص ۳۹۸

۳۔ سورۃ العلق، القرآن، آیت ۱

۴۔ محی الدین قادری زور، سید، "ہندوستانی لسانیات"، مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور، جنوری ۱۹۶۱ء، ص ۳۱۔۳۳

۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریحی لسانیات، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی ۱۹۹۸ء، ص ۱۳

۶۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر، اردو زبان اور اس کی تعلیم، پاکستان بک سٹور، لاہور ۱۹۶۲ء، بار دوم، ص ۶

۷۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۸۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل و لطائف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۷

۹۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر (مترجم)، ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص ۶۴

۱۰۔ کیفی، برج موہن دتاتریہ، پنڈت، کیفیہ، معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۶۰

۱۱۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ص ۱۹۶۰ء، ص ۳۳۔۳۲

۱۲۔ محمد حسن ہادی، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، ۲۰۱۰ء، ص ۶۲

۱۳۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے؟، بیکن بکس گلگشت، ملتان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵

۱۴۔ فیروز الدین، مولوی (مرتب)، فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، س ن، ص ۱۱۵۵

۱۵۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۸۱۸

۱۶۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد شانزدہم ۱۶، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی، جون ۱۹۹۶ء، ص ۸۷۷

۱۷۔ Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English, Sixth Edition, AS Hornby Edited by Sall Wehmeil, Oxford University Press.

۱۷۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، ص ۱۲۳

۱۸۔ نصیر احمد خان، اردو لسانیات، اردو محل پبلیکیشن، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۱۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۰۔ محمد علی صدیقی، مضامین، ادارہ عصرِ نو کراچی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۱ء، ص ۹۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۲۔ سبط حسن، ادب اور روشن خیالی، نورانی مکتبہ دانیال، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص ۴۰

۲۳۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو زبان اور لسانیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۲

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کیا ہے؟، ص ۹۸

۲۵۔ عائشہ سعید، مقالہ، اردو کا لسانی سرمایہ، مشمولہ "دریافت" سالانہ شمارہ ۶، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۶۰۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۱۰

۲۷۔ عبد اللہ، ڈاکٹر، سید (مرتب)، نوادر الالفاظ، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۵

۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کیا ہے؟، ص ۲۸۱

۲۹۔ آزاد، آب حیات، ص ۹۶

۳۰۔ عبد اللہ، ڈاکٹر، سید، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۷

۳۱۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۰

۳۲۔ نقی حسین جعفری، مضمون، غالب کا آئین غزل خوانی، مشمولہ، تنقیدی تناظرات، مرتب اسلوب احمد انصاری، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۳۴۔ وارث کرمانی، ڈاکٹر، مضمون، غالب کی شاعری کا پس منظر، مشمولہ، نقوش غالب نمبر، حصہ اوّل، شمارہ ۱۱۱، ادارہ فروغ اردو، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۳۸

۳۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو اب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۶۹۹

۳۶۔ غالب، غالب کے خطوط جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، ڈاکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸۴۶

۳۷۔ حالی، یادگار غالب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۲

۳۸۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد دوم، حصہ اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم ۱۹۹۴ء، ص ۴۹۱۔۴۹۲

۳۹۔ فراقی، تحسین، ڈاکٹر، تنقیداتِ تحسین فراقی (منتخب مقالات) مرتبہ اشتیاق احمد، القمر انٹرپرائزز، لاہور، طبع اوّل ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۹۔۱۲۰

۴۰۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد دوم، حصہ اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم ۱۹۹۴ء، ص ۴۹۷۔۴۹۸

۴۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غالب کا فن، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۰

۴۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، مضمون، غالب کے طلسم معنی پر ایک نظر، مشمولہ، اردو کے چار بڑے شاعر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۳

۴۳۔ محمد اکرم، شیخ، غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷